ہریانہ کی فارسی خدمات

ڈاکٹر دھرم دیو سوامی

نام کتاب : ہریانہ کی فارسی خدمات

مصنف : ڈاکٹر دھرم دیو سوامی

طباعت :

اشاعت : نومبر ۲۰۰۴

ناشر : ڈاکٹر دھرم دیو سوامی، ۵۳، بلاک E-1، پاکٹ ۱۱، سیکٹر ۱۵، روہنی، دلّی-۸۵

تعداد : ۴۰۰

کمپوزنگ : فراہی کمپیوٹرس، 400/1/19A، منیر کا، نئی دہلی-۱۱۰۰۶۷

قیمت : ۱۲۵ روپے

یہ کتاب اردو اکادمی دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

انتساب
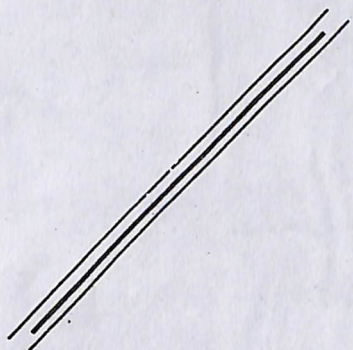
اپنی اس ناچیز کوشش کو

اپنے مربّی

جناب مالک رام مرحوم

کے نام

معنون کرتا ہوں

مقدمہ

میں سوامی صاحب کو اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے
''طبقات شاہجہانی'' مصنفہ محمد صادق ہمدانی، کی تحقیق و تالیف میں مصروف تھے۔ انھوں نے
ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے بعد بھی فارسی زبان و ادب سے اپنا ذوق و شوق باقی رکھا اور
''ہندوستان کی اساطیری داستانوں'' اور ''جپ جی'' ''رانو''، دیوداس جیسی اہم کتابوں کو فارسی کا
جامہ پہنایا اور انھیں شائع کرایا۔

پچھلے پچیّس سالوں سے آل انڈیا ریڈیو کی ''دری یونٹ'' سے وابستہ ہیں۔
''ہریانہ کی فارسی خدمات'' اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے جس کے لیئے انھوں نے
کئی سال مشقت کی ہے اور ذوق و جستجو ان کو متعدد لائبریریوں، میوزیم اور اہم شخصیات کے
کتابخانوں کی سیر کرا چکا ہے اور گوشوں، مدارس، مساجد اور خانقاہوں سے تاریخی، ادبی، علمی اور
دینی مواد حاصل کر کے یکجا کر دیا ہے۔

آج کی دنیا میں علاقائیت کو بہت اہمیت دی جا رہی ہے اور لوگ اپنے اپنے ادیبوں،
مورخوں شاعروں اور علمی شخصیات کو جواب تک گوشہ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے، تلاش کر کے
ان کی خدمات اور تصنیفات کو منظر عام پر لا رہے ہیں۔ جمہوریت کی یہ بھی بہت بڑی دین ہے کہ
عام اور فراموش شدہ نوادر بھی منظر عام پر لانے کے مواقع فراہم کر رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ
''ہریانہ'' جو آزادی سے قبل آزاد حیثیت کا مالک نہیں تھا مگر اس کی سرزمین نے فارسی زبان و ادب

کی بڑی خدمت کی ہے، اب سوامی صاحب کے قلم کی بدولت فارسی دنیا میں متعارف ہو جائے گا۔ سوامی صاحب ہمارے کئی علماء اور دانشوروں کے شاگرد رہے ہیں جن میں پروفیسر بھاگوت سروپ، جناب مالک رام صاحب اور پروفیسر سید امیر حسن عابدی کے نام قابل ذکر ہیں جن کے فیض کی بدولت سوامی جی نے یہ گرانقدر تصنیف منظر عام پر لانے کی ہمت کی ہے۔ ان کی حوصلہ افزائی اہلِ علم اور خصوصاً فارسی داں حلقہ کے لئے نہ صرف ان کو مزید کام کرنے پر آمادہ کرے گی بلکہ فارسی کی خدمت بھی انجام دے گی۔

شعیب اعظمی

۹ر فروری ۲۰۰۳ء

جامعہ نگر، نئی دہلی - ۲۵

حرف آغاز

جب میں پی. ایچ. ڈی. کے مقالے کے لیے ''محمد صادق ہمدانی'' کے قلمی فارسی تذکرہ ''طبقات شاہجہانی'' پر کام کر رہا تھا تو اس تذکرے میں ہریانہ کے بہت سے شعرا، علما اور اصفیا کے نام سامنے آئے۔ ایک تو یہ کہ میرے تحقیقی کام کی ابتدا تذکرے سے ہوئی، اس لیے تذکرے سے مجھے خاص دلچسپی ہو گئی، دوسرے یہ کہ میں ہریانہ (چرخی دادری) کا رہنے والا ہوں، اس لیے خیال آیا کہ ہریانہ کے فارسی شعرا، علما اور اصفیا کا تذکرہ مرتب کیا جائے۔ لہذا جب ۱۹۸۸ میں میرے مقالے کا کام پورا ہو گیا تو ''ہریانہ کی فارسی خدمات'' پر کام شروع کیا۔ ایزد متعال کے لطف و کرم، اساتذہ کی رہنمائی، بزرگوں کی توفیق اور دوستوں کی نیک خواہشات کا نتیجہ ہے کہ یہ کام بھی پایہ تکمیل کو پہنچا اور ''ہریانہ کی فارسی خدمات'' آپ کے مبارک ہاتھوں میں ہے۔

آج کل جس طرح ہریانہ صوبے میں ایک علاقہ ''میوات'' کے نام سے جانا جاتا ہے، اسی طرح مشترکہ پنجاب میں ایک علاقہ صدیوں سے ''ہریانہ'' کے نام سے جانا جاتا تھا اور وہی علاقہ یکم نومبر ۱۹۶۶ کو رسمی طور پر مستقل صوبہ قرار دیا گیا۔

یہ تذکرہ حسب ذیل ابواب پر مشتمل ہے:

باب اول: ہریانہ

باب دوم: اسلامی تعلیم کا طور طریقہ

باب سوم: ہریانہ میں فارسی زبان و ادب

باب چہارم: اصفیا

باب پنجم : علما

باب ششم : شعرا

مواد جمع کرنے کے لیے بہت سے فارسی، اردو اور حتیٰ عربی (نزہۃ الخواطر) کے تذکروں، سوانح عمریاں، تواریخ اور دیگر مربوطہ کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے، لیکن بہت سے فارسی اور اردو کے پرانے تذکروں تک، نایاب ہونے کی وجہ سے، رسائی نہ ہوسکی، ممکن ہے کہ ان تذکروں میں کچھ اور مواد مل جاتا۔ لہذا حتیٰ الامکان کوشش کے بعد بھی میں دعوے سے یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ''ہریانہ کی فارسی خدمات'' پر یہ حرف آخر ہے، البتہ اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ہریانہ میں فارسی زبان اور ادبیات کے ارتقاع اور ارتقا پر حرف اول ہے، کیوں کہ اب تک کوئی ایسی کتاب نظر سے نہیں گزری جو ہریانہ کے فارسی شعرا، علما اور اصفیا کے حالات، ان کے کلام اور تصانیف اور اصفیا کی فارسی زبان میں پند و وعظ کے ذریعہ، فارسی کی خدمات کا اتنی تفصیل سے احاطہ کرتی ہو۔

اس تذکرے میں فارسی کے ان شعرا، علما اور اصفیا کو شامل کیا گیا ہے جو یا تو ہریانہ میں پیدا ہوئے اور وہیں رہے یا روزی روٹی کے لیے ہریانہ سے باہر چلے گئے، یا پھر ہریانہ سے باہر پیدا ہوئے اور ذریعہ معاش کے لیے آکر ہریانہ میں بس گئے۔ اس تذکرے میں ایسے شعرا اور علما کو بھی شامل کیا گیا ہے جن کے اشعار کے نمونے یا تصانیف نہیں مل سکیں یا یادگار نہیں چھوڑیں، لیکن مختلف تذکروں میں حوالہ ضرور ملتا ہے کہ فلاں فارسی کا شاعر یا عالم تھا۔ ایسے حوالے اردو تذکروں میں ملتے ہیں کہ فلاں اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا لیکن اردو تذکرہ ہونے کی وجہ سے فارسی اشعار کے نمونے نہیں دے جاتے تھے اور اب بھی نہیں دیتے ہیں۔ محض اشعار کے نمونے نہ ہونے یا تصانیف کے نہ ملنے سے، اُن فارسی داں کو چھوڑ دینا مناسب نہیں لگا۔ کم سے کم ان کے نام تو ایک جگہ جمع ہو گئے۔

اس تذکرے میں کچھ ایسے اصفیا و مشایخ کے حالات بھی درج کیے گئے ہیں جنھوں نے کوئی تصنیف نہیں چھوڑی۔ اس لیے یہ گمان ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ایسی کیا فارسی خدمات انجام دی ہیں جو ان کو تذکرے میں شامل کیا گیا ہے۔

تقریباً انیس صدی کے نصف سے پہلے کے جتنے بھی اصفیا اور مشایخ ہوئے ہیں، ان کی زبان تکلم فارسی ہی تھی اور اپنے پند و وعظ میں بھی اُسی زبان کا استعمال کرتے تھے۔

خیر المجالس، فوائد الفواد، سرور الصدور، سالک السالک، دلایل العارفین، افضل الشواہد اپنے زمانے کے نامور اصفیا و مشایخ کے ملفوظات ہیں جو ان کے مریدوں نے مرتب اور شایع کیے اور آج بھی فارسی زبان کے گرانبہا سرمایہ میں شمار ہوتے ہیں۔ براہِ راست نہ صحیح، بالواسطہ فارسی زبان اور ادب کی ترقی میں ان کے حصے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

میں جناب مالک رام صاحب (پ: ۱۹۰۶، م: ۱۹۹۳) کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس کتاب کی تکمیل میں ان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے جمع کردہ تذکروں سے استفادہ کرنے کا موقع دیا، بلکہ اپنے قیمتی وقت میں سے وقت نکال کر متن کی تصحیح بھی کی۔ اس کے علاوہ ان کی محبت، دعائیں اور مشفقانہ توجہ ہمیشہ مجھے حاصل رہی ہیں۔

ہردیال سنگھ، انڈین کونسل آف کلچرل ریلشنز، انڈین کونسل آف ہسٹوریکل ریسرچ، نیشنل آرکایوز اور نیشنل میوزیم کی لائبریریوں کے کارکنان کا بھی بہت شکرگزار ہوں جنھوں نے اپنے یہاں موجود کتابوں سے استفادہ کرنے میں میری مدد کی۔

ڈاکٹر دھرم دیو سوامی

دہلی

فہرست

باب پنجم ۶۸
اصفیاء

باب ششم
شعرا

باب اول

ہریانہ

شالاک اور الور بیچ ہریانہ جت گھی دودھ دہی کا کھانا[1]

(ہریانہ شوالک پہاڑیوں اور الور کے بیچ بسا ہوا ہے۔ یہاں پر گھی، دودھ اور دہی فراوانی سے کھایا جاتا ہے)

اگر آپ کسی بھی سڑک سے (سوائے غازی آباد کی طرف جانے والی کے) دلّی سے باہر جائیں تو سب سے پہلے جو زمین آپ کے قدموں کو بوسہ دیگی، وہ ہے ہریانہ کی زرخیز زمین۔

ہریانہ کو ہریانہ کیوں کہا جاتا ہے اور اس کا مصدر اور مطلب کیا ہے، اس کے بارے میں مورخین، علماء اور فضلاء کی مختلف رائے ہیں۔

جناب ''راہل سانسکرتیاین'' کا کہنا ہے کہ لفظ ''ہریانہ'' کا مصدر ''هری دیانیک'' ہے جس کا ادبیات قدیم میں فراوانی سے استعمال ہوا ہے[2]۔

آچاریہ بھگوان دیو کی رائے میں اس صوبے کا نام ''ہریانہ'' اس لئے پڑا کہ یہاں کے لوگ ''ہر'' (شو) کی عبادت خاص طور پر کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں[3]۔

ڈاکٹر بدھ پرکاش اور ڈاکٹر واسو دیو شرن اگروال کا خیال ہے کہ مہابھارت کے دورہ اول میں یہ علاقہ ''آبھیروں'' یا ''اہیروں'' کے زیر تسلط تھا۔ اس وجہ سے یہ علاقہ ''آبھیریانہ'' کہلانے لگا اور آبھیریانہ ہی بگڑ کر اول ''اہیریانہ'' اور پھر اہیریانہ سے بگڑ کر ''ہریانہ'' کہلانے لگا[4]۔

1۔ (۱-۳) ہمارے دیش کے راجیہ: ۵؛ ہریانہ: ۱۲-۱۳

4۔ ہمارے دیش کے راجیہ: ۵-۶؛ ہریانہ: اسٹڈیز ان ہسٹری انڈین کلچر: ۴۲، ہریانہ: ۱۲-۱۳

ڈاکٹر ہری رام گپت مانتے ہیں کہ ہریانہ لفظ ''آریانا'' سے بنا ہے، کیونکہ زمانۂ قدیم میں آریہ لوگ یہاں کے متوطن تھے[1]۔

''اسکند پران''، میں جو نویں اور دسویں عیسوی میں تالیف ہوا، ایک باب ''کماریکہ کھنڈ'' کے نام سے ہے۔ اس میں کچھ صوبوں کے ناموں کی ایک فہرست ہے، جس میں ایک نام ''ہریالہ'' یا ''ہریپالہ'' ہے، جو بگڑ کر ہریانہ بن گیا[2]۔

دلّی میوزیم کے ۱۳۲۸ء (۷۲۹ھ) کے ایک کتبے پر ''ہریانہ'' اور پالم باولی کے کتبے پر ''ہریانکہ'' نام ملتا ہے، جو بعد میں بگڑتے بگڑتے ہریانہ بن گیا[3]۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ''راجہ ہریش چندر'' اودھ سے یہاں آئے اور کچھ دن یہاں قیام کیا۔ ان کے نام کی مناسبت سے اس کا نام ہریانہ پڑ گیا[4]۔

امپیریل گزٹیر آف انڈیا کے مطابق زمانہ قدیم میں یہ علاقہ زرخیز اور ہرا (ہریالی) تھا۔ اس لیے ہریالی سے بگڑتے بگڑتے ہریانہ کہلانے لگا[5]۔ غرض جتنے منھ، اتنی باتیں۔

ہریانہ ہندوستان میں آریائی تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ کوروکشیتر اس کا مرکز تھا، جہاں مہابھارت کی عظیم لڑائی لڑی گئی اور شریمد بھگوت گیتا کی تخلیق ہوئی۔ چوتھی صدی عیسوی میں ہریانہ پر ''گپت'' خاندان کے ''چندر گپت'' اول (۳۲۰-۳۳۰ قبل مسیح) کی حکومت رہی۔ چھٹی صدی عیسوی میں ہونوں کے حملے نے گپت سلطنت کا خاتمہ کردیا اور بیس پچیس سال تک خود یہاں حکمران رہے۔ پھر تھنیسر (کوروکشیتر) میں ''وردھن'' خاندان وجود میں آیا۔ اس خاندان کے دورِ حکومت (۶۰۶-۶۴۷ء) میں اس علاقے نے بہت ترقی کی۔ ''ہرش وردھن'' کی موت کے بعد اس علاقے میں افراتفری پھیل گئی۔ ہونوں اور ترکوں کے حملوں نے یہاں کی خوشحالی کو تباہ و برباد کردیا۔ نویں اور دسویں صدی میں یہاں ''چوہان'' خاندان کا دور دورہ رہا۔ ۱۱۹۲ء میں پرتھوی راج چوہان کی محمد غوری (م ۱۴ مارچ ۱۲۰۶ء)[6] کے ہاتھوں شکست کے بعد یہ علاقہ مختلف خاندانوں کے زیرِ نگین رہا۔

۱۳۵۰ء میں فیروز شاہ تغلق کی حکومت قائم ہوئی۔ اس نے حصار اور فتح آباد نام کے دو شہر بسائے تھے۔

۱۴۱۰ء میں شیر شاہ خاندان کے خضر خاں (م ۴، جون ۱۴۲۱ء) نے اس علاقے پر قبضہ کرلیا۔

(۱-۵) ہمارے دیش کے راجیہ: ۵-۶؛ ہریانہ: اسٹڈیز ان ہسٹری انڈین کلچر: ۴۲، ہریانہ: ۱۲-۱۳

۶ این اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری: ۳۶۱

لیکن اکبر (۱۵۵۶-۱۶۰۵ء) نے روہتک اور حصار کو دلی کے ساتھ ملا لیا۔

اورنگ زیب (۱۶۵۸-۱۷۰۷ء) کی وفات کے بعد حصار پر نواب شاہ داد خاں کی حکومت
رہی۔ اس نے ۱۱۵۰ھ (۱۷۳۷) تک حکومت کی۔ اس کے بعد ہریانہ میں بے ثباتی رہی۔ روہتک اور مہم
کا علاقہ گوڑ گانوں کے نواب فوجدار خاں کے پاس آگیا اور ۱۷۴۷ء میں حصار کا علاقہ بھی اسے عطا ہوا۔

شاہ عالم (۱۷۱۹-۱۷۴۸ء) کے زمانے میں ہریانہ کے مختلف علاقوں پر مختلف حاکموں[1] کی
حکومتیں رہیں۔ بہادر گڈھ پر نواب بہادر خاں پہلے ہی سے حکومت کرتا آرہا تھا۔ جھجر پر سردھنہ کی بیگم سمرد
(م۔ ۲۷ جنوری ۱۸۳۶ء[2]) کے شوہر ''ہروالٹر ان ہارٹ (م ۱۷۷۸ء[3]) کی حکومت تھی۔ گوہانہ، مہم، روہتک اور
کھر کھودا پر دلی کے صدر اعظم نجف خاں (م ۲۲ر اپریل ۱۷۸۲ء[4]) اور ہانسی اور حصار پر سکھوں کے پھول
خاندان کی حکومت رہی۔

۳۰ دسمبر ۱۸۰۳ء کو برٹش انڈیا کمپنی نے مرہٹوں کے سرغنہ دولت راؤ سندھیا (م ۱۸۲۷ء[5]) سے
یہ علاقہ چھین لیا۔ انگریزوں نے انتظامی سہولت کے مدنظر صرف دلی کے شمال جنوب میں چالیس میل کی
پٹی مستقل طور پر اپنے قبضے میں رکھی جس میں پانی پت، سونی پت، سنبھالکا، گنور، حویلی پالم شمال میں، اور
نوہ، ہتین، تجارہ، بھوڑ، تاوڑ، سوہنہ، ریواڑی، اندری، پلول نگینہ اور فیروز پور جھرکا کے علاقے جنوب میں
شامل تھے اور باقی سارا ہریانہ مختلف حکمرانوں میں بانٹ دیا گیا[6]۔

۱۸۵۷ء کے غدر میں ہریانہ نے بڑی مستعدی سے حصہ لیا۔ بلب گڑھ کے راجہ ناہر سنگھ، جھجر
کے نواب عبدالرحمٰن خاں (م: ۲۳ دسمبر ۱۸۵۷ء) ریواڑی کے راؤ کرشن گوپال اور راؤ تلا رام نے ہریانہ
میں اس غدر کی رہنمائی کی۔ ناہر سنگھ اور عبدالرحمٰن کو پھانسی پر چڑھنا پڑا۔ راؤ کرشن گوپال میدان جنگ میں
کام آئے اور راؤ تلا رام کو ملک سے بدر ہونا پڑا۔ انہوں نے ۱۸۶۳ء میں افغانستان میں وفات پائی[7]۔

نومبر ۱۸۵۷ء تک انگریز ہریانہ میں غدر کو دبانے میں کامیاب ہوگئے اور اس کے فوراً بعد
ہی اس علاقے کو شمالی مغربی صوبے (آج کا اتر پردیش) سے الگ کر کے ۱۸۵۷ء میں پنجاب سے
ملحق کر دیا گیا[8]۔

۱؎ ہمارے دیس کے راجیہ: ۵-۱۵؛
این اورینٹل بایوگرفیکل ڈکشنری: ۱۱۹، ۲۸۹، ۳۷۳
۲-۵؎ این اورینٹل ... ؛ اسٹڈیز ان ہسٹری اینڈ کلچر: ۲:۷، ۸۴؛ ہمارے دیش کے راجیہ: ۱۶
۶؎ ہریانہ: ۱۶:-۳۲؛ ہریانہ اسٹڈیز ان ہسٹری اینڈ کلچر: ۲:۷، ۸۴؛ ہمارے دیش کے راجیہ: ۱۶
(۷-۸) ہریانہ: ۱۶-۳۲؛ ہریانہ اسٹڈیز ان ہسٹری اینڈ کلچر: ۲:۷، ۸۴؛ ہمارے دیش کے راجیہ: ۱۶

آج کا ہریانہ وقت کے حالات کی پیدائش ہے ۔ زبان کی بناپر جب صوبوں کی دوبارہ حد بندی کی گئی تو یکم نومبر ۱۹۶۶ء کو انبالہ، کرنال ، روہتک ، حصار، گوڑ گانوں، جیند اور مہندر گڑھ کے سات ضلعوں کو پنجاب سے الگ کر کے ایک نیا صوبہ "ہریانہ" بنادیا گیا[۱]۔ بعد میں سرسہ، بھوانی ، کورکشیتر ، سونی پت ،فرید آباد ، یمنا نگر، پانی پت ،ریواڑی، جھجر اور کیتھل کو بھی ضلع کا درجہ دے دیا گیا۔

---

۱ ہمارے دیش کے راجیہ :۱۹

باب دوم

اسلامی تعلیم کا طور طریقہ

دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں بھی تعلیم کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اسلامی ممالک کے تمام بڑے شہر بغداد، قاہرہ، دمشق، نیشاپور، قرطبہ، قیروان، اشبیلیہ وغیرہ سب اس بات کے گواہ ہیں[1]۔ ان تمام اسلامی تعلیمی مراکز کا مدار دینی تعلیم تھا۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، ماسوائے قرآن مجید، فقہ، حدیث اور تفسیر کے، باقی سب مضامین جیسے تاریخ، فلسفہ، تصوف، معقولات، جغرافیہ، ادبیات وغیرہ فارسی ہی میں پڑھائے جاتے تھے اور جو کچھ بھی لکھا گیا وہ بھی بیشتر فارسی ہی میں لکھا گیا۔ اس لئے ہندوستان میں اسلامی تعلیم کے طور طریقے کے مطالعے کا مقصد، یہاں فارسی زبان کی ابتداء، ارتقاء وارتفاع پر ایک اجمالی نظر ڈالنا ہے۔

یہ امر مسلم ہے کہ ہندوستان میں فارسی زبان مسلمانوں کے ساتھ آئی[2]۔ یوں تو جس مسلمان نے سب سے پہلے ہندوستان میں قدم رکھا اور جس نے اہل ہند سے معرکہ آرائیاں کیں، وہ م ”مہلب بن ابی صفرہ“ تھا[3]۔ گو ہندوستان میں مسلمانوں کا ورود ”محمد بن قاسم“ کے حملے (۱۱۷ھ/۱۳۱۱ء) کے ساتھ ہوا، لیکن اس کا دور دورہ اور اثر ملتان ہی تک محدود رہا۔

جو فارسی زبان فارس میں وجود میں آئی اور جس نے خراسان میں نشو ونما پائی اور جس فارسی سے فردوسی نے عجم کو زندہ جاوید کیا اور جسے شیخ سعدی اور حافظ شیرازی نے دنیا کے کونے کونے میں پھیلایا

---

[1] ایجوکیشن ان مسلم انڈیا: ۳؛ کاشیر: ۳۴۴

[2] دِی دہلی سلطنت: ۵۳۳

[3] تاریخ فرشتہ: ۱: ۱۸

اس فارسی زبان کو سب سے پہلے ہندوستان میں لانے والا محمود غزنوی[1] تھا۔ اکثر مورخین اور محققینِ لسانیات معترف ہیں کہ ہندوستان میں فارسی زبان ۱۰۰۱ء میں محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملے کے ساتھ آئی[2]۔ بہت سے شعرا، مورخین، علماء اور فضلاء بھی اس کے ہمراہ تھے، جن میں ایک البیرونی[3] بھی تھا۔ ۱۰۰۱ء سے لے کر ملک کی آزادی کے تقریباً ۱۱۰ سال پہلے تک فارسی ملک کی رسمی زبان رہی۔ اس کے بعد یہاں فارسی بطور ثانوی زبان استعمال ہونے لگی۔ تمام مدارس میں اس کی تعلیم کا انتظام تھا اور فارسی کا جاننا اس میں قابلیت حاصل کرنا باعث امتیاز اور فخر خیال کیا جاتا تھا۔

کرنل عبدالرشید[4] کا تو خیال ہے کہ پنجاب میں فارسی زبان، اسلام سے پہلے موجود تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہخامنشی خاندان کی حکومت دریائے ستلج تک پھیلی ہوئی تھی اور ان کی زبان فارسی تھی۔ پھر یونانی، پارسی اور ساسانی آئے اور ان کی زبان بھی فارسی ہی تھی۔ یونانیوں کی فوج میں بھی، جو پنجاب پر قابض ہوگئی تھی، اکثریت ایرانیوں کی تھی۔ اسکندر کی فوج میں فارسی بولنے والوں کی تعداد کافی تھی، کیونکہ یہ ایران سے ہوتے ہوئے پنجاب پہنچی تھی۔

ہمارا مطالعہ ہریانہ میں فارسی زبان کی نشوونما تک محدود ہے، اس لئے یہ بیمحل ہوگا کہ ہم ہندوستان بھر مین فارسی زبان کی ترقی اور ترویج، پادشاہون کی سرپرستی، فارسی تصانیف، معروف شعراء یا علماء وفضلاء کا تفصیلی تذکرہ کریں یا اس بارے میں لکھا جائے کہ کس طرح ہندوستان میں نہ صرف یہ کہ فارسی زبان پڑھی لکھی گئی، بلکہ یہاں گرانبہا فارسی آثار کی تخلیق بھی ہوئی۔ البتہ اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ اس دور مین فارسی زبان میں ہر موضوع پر اتنی کتابیں لکھی گئیں اور سنسکرت سے فارسی زبان مین اتنے ترجمے ہوئے کہ ہندوستان، ایران کے بعد فارسی کتب کا دنیا کا سب سے بڑا مرکز بن گیا اور یہ فخر اسے آج بھی حاصل ہے۔ دلی ہندوستان کا سمرقند، جونپور شیرازِ ہند اور کشمیر ایرانِ صغیر کہلانے لگے[5]۔

ہندوستان میں اسلامی تعلیم:

ہندوستان مین دور سلاطین (۱۲۰۶-۱۵۲۶ء) بلکہ اس کے بعد مغلیہ دور مین بھی ''محکمہ تعلیم''

---

[1] ولادت: ۳۵۷ھ/۹۶۷ء، وفات ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء

[2] پنجاب انڈر سلطانز: ۱:۱۷

[3] ولادت: ۳۶۲ھ/۹۷۲، وفات: ۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء، تاریخ ادبیات ایران: ۱۳۲

[4] مصنف تذکرہ شعراے پنجاب: ۷

[5] ہند وایران: شمارہ: ۲: سال ۴، ۴۵

نام کا کوئی الگ ادارہ نہیں تھا[1]۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ تعلیم کی ذمہ داری حکومت کی نہیں تھی۔ لیکن باجود حکومت کے عطیوں، شخصی اوقاف اور افراد، مقبول اصحاب کی اعانت سے تعلیمی اداروں کی مالی ضرورتیں پوری ہوتی رہتی تھیں[2]۔ سلاطین کے دور میں صدر الصدورِ حکومت کا ایک فرض یہ بھی تھا کہ سلطان سے علماء وفضلاء کے ناموں کی سفارش کرتے تا کہ حکومت کی طرف سے ان کا وظیفہ مقرر کیا جاسکے اور علم دوست لوگ اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔ یہی علماء تعلیمی نصاب کی تشکیل اور تعلیمی نظم ونسق کے لئے ذمہ دار ہوتے تھے[3]۔

مغلیہ سلطنت کے بانی بابر (۱۵۲۶ء-۱۵۳۰ء) کے محکمہ ''شہرتِ عام'' کا ایک کام تعلیمی اداروں کے لئے عمارتوں کی تعمیر اور سرکاری گزٹ کی اشاعت بھی تھا[4]۔

ہندوستان کے اسلامی دور میں تمام مسلمان بادشاہ شاہزادے صوبائی حکمران اور امرا ہمیشہ اسلامی تعلیم کی تبلیغ اور ترویج کے لئے کوشا رہے۔ متعدد دوسرے اسباب کے علاوہ اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ اکثر پادشاہوں جیسے نصیرالدین محمود (۱۲۴۶-۱۲۶۶ء) غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶-۱۲۸۶ء) محمد شاہ تغلق (۱۳۲۵-۱۳۵۱ء)، فیروزشاہ تغلق (۱۳۵۱-۱۳۸۸ء)، اسکندر لودی (۱۴۸۸-۱۵۱۷ء)، بابر (۱۵۲۶-۱۵۳۰ء) ہمایوں (۱۵۳۰-۱۵۵۶ء)، اکبر (۱۵۵۶-۱۶۰۵ء)، جہانگیر (۱۶۰۵-۱۶۲۷ء)، شاہجہاں (۱۶۲۷-۱۶۶۶ء) اورنگزیب عالمگیر (۱۶۶۶-۱۷۰۷ء) نیز شاہزادوں میں محمد بن غیاث الدین بلبن اس کے بھائی طغریٰ خاں، داراشکوہ (۱۶۱۵-۱۶۵۹ء)؛ صوبائی حکام اور دوسرے اُمرا میں حسین مرزا (ملتان)، ابراہیم شرقی (جونپور)، عیاث الدین اول و ثانی، ظفر خان احسن (بنگال)، حسین شاہ (کشمیر)، سلطان حسین شاہ (گجرات)، فیروز شاہ (بہمن)، قلی خاں، خان زمان، خان اعظم کوکلتاش اور غازی خان نے نہ صرف یہ کہ اپنی شاہانہ فیاضیوں سے ابر رحمت کی طرح کشت سخن کو سرسبز اور شاداب رکھا، بلکہ وہ خود بھی تعلیم یافتہ، مصنف، شاعر اور قدردان سخن اور سخنور تھے[5]۔

1۔ ایجوکیشن ان مسلم انڈیا: ۹؛ ایجوکیشن ان مڈیول انڈیا: ۱۰

2۔ اڈوانسڈ اسٹڈی ان دی ہسٹری آف میڈیول انڈیا، میڈیول انڈین سوسائٹی اینڈ کلچر: ۱۵۶

3۔ پنجاب انڈر سلطانز: ۱۶۷

4۔ این اڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا، ۵۷۱؛ ایجوکیشن ان مڈیول انڈیا: ۱۰

5۔ پنجاب انڈر سلطانز، ۱۶۸؛ این اڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا: ۵۷۱-۵۷۷

اسلامی تعلیم کا مقصد:

اسلام میں دینی تعلیم ہی کا دوسرا نام تعلیم ہے۔ کیونکہ دین ہمیشہ تعلیم کے دوسرے تمام اجزا پر حاوی رہا ہے اور یہ حقیقت اسلامی تعلیم کے نصاب ہی سے واضح ہو جاتی ہے اسلام میں تعلیم کا اصل مقصد، دینی عقائد سے آگاہی حاصل کرنا تھا۔ اس کے تمام اجزا سے مقصود ان عقائد کی توثیق اور تائید تھی۔ اس سے اسلام کی تبلیغ وترویج میں بھی نمایاں مدد ملی۔ گویا اسلامی تعلیم نوع بشر کے لئے اپنے مقصد کے حاصل کرنے یا اسلامی برادری کے عقائد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا ایک وسیلہ تھا۔ اسلامی تعلیم کا ایک اہم فائدہ یہ بھی تھا کہ حکومت کو تعلیم یافتہ اور باصلاحیت قاضی، مفتی اور حاکم مل جاتے تھے[1]۔

لیکن اسلامی تعلیم کا مقصد بھی وقت اور حالات کی ضرورت کے مطابق بدلتا گیا۔ مثلاً سلطنت دور میں بہت حد تک اس کا مقصد مذہبی عقائد کا استحکام تھا، لیکن مغلیہ دور میں (خاص طور پر اکبر کے زمانے میں) اس نے سیاسی صورت اختیار کرلی اور اب اس کا نصب العین ہندوستان کی وحدت یعنی مذہبی، سیاسی اور تمدنی وحدت بن گیا[2]۔

تعلیمی ادارے:

تعلیمی ادارے دو طرح کے تھے۔

۱۔ مکتب

۲۔ مدرسہ

مکتب:

ان میں صرف ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی، زمانۂ قدیم میں مکتب کے لئے کوئی علیحدہ عمارت نہیں ہوا کرتی تھی۔ عموماً مکتب، مسجد ہی کا ایک حصہ ہوتا تھا اور مسجد کا متولی، امام یا مولوی مکتب چلاتا تھا۔ طلبا سے کوئی فیس نہیں وصول کی جاتی تھی۔ البتہ احترام کے طور پر طلباء اساتذہ کا شخصی کام کردیا کرتے یا پھر کسی عید یا تہوار کے موقع پر کچھ اناج اساتذہ کے گھر بھجوادیتے یا کچھ نذرانہ پیش کردیتے[3]۔

---

[1] اڈوانسڈ اسٹڈی اِن دی ہسٹری آف میڈیول انڈیا، میڈیول انڈین سوسائٹی اینڈ کلچر: ۱۵۶

[2] ایجوکیشن ان مسلم انڈیا: ۲۹، ۸۹

[3] اڈوانسڈ اسٹڈی اِن دی ہسٹری آف میڈیول انڈیا، میڈیول انڈین سوسائٹی اینڈ کلچر: ۱۵۶

مدرسہ:

اعلیٰ تعلیم کے مرکز کو مدرسہ یا جامعہ کہتے تھے۔ آج کل یہ زیادہ تر کالج یا یونیورسٹی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ مکتب کی طرح مدرسے بھی مسجد ہی سے ملحق ہوتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے یہ مراکز، حکومت کے نظم ونسق میں ہوتے تھے اور ان کے اخراجات کے لئے ساری مالی امداد حکومت کی طرف سے ملتی تھی[1]۔

پرانے زمانے کی مسجدوں میں صحن کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے حجرے بنے ہوتے تھے۔ یہ طلباء اور مدرسین کی اقامت گاہ کا کام دیتے تھے۔ دلی کی فتحپوری مسجد اور اکبر آباد کی مسجد میں یہ حجرے آج تک اسی کام میں آتے ہیں[2]۔

گھریلو تعلیم:

اس کے علاوہ کچھ پڑھے لکھے لوگ اور علم پرور عالم اور مولوی اپنے گھروں میں مکتب کھول لیا کرتے یا پھر کچھ امیر لوگ اپنے گھروں میں کھلوادیا کرتے تھے۔ بعض اوقات گاؤں کے لوگ مل کر چوپال میں مکتب کھلوادیتے، جہاں کوئی ملا یا مولوی بچوں کو پڑھایا کرتے یا پھر لڑکے اپنے گھروں میں اپنے والدین سے پڑھتے تھے[3]۔ لائیٹز نے ایسے بہت سے مکتبوں کا ذکر کیا ہے۔ لائیٹز نے اپنی کتاب[4] میں اساتذہ کے محنتانہ کی دلچسپ مثالیں دی ہیں۔

دوآنے فی شاگرد۔

دوروپیہ مہینہ۔

روزانہ خوراک۔

بعض ملا اور مولوی اپنے آپ میں مکمل تعلیم کا مرکز ہوتے تھے۔ یہ لوگ نہ صرف طلباء کو اپنے گھروں پر تعلیم دیتے، بلکہ ان کی رہائش اور کھانے پینے کا انتظام بھی کرتے تھے[5]۔

---

1. اے سوشل کلچرل اینڈ اکانومک ہسٹری آف انڈیا: ۱۵۳
2. ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں: ۱۵
3. ایجوکیشن ان مڈویئل انڈیا: ۲۶؛ ایجوکیشن ان مسلم انڈیا: ۷۱؛ اڈوانسڈ اسٹڈی ان دی ہسٹری آف میڈیول انڈیا، میڈیول انڈین سوسائٹی اینڈ کلچر: ۱۵۶
4. ہسٹری آف انڈجینس ایجوکیشن ان پنجاب حصہ دوم: ۱۳، ۱۸، ۲۸
5. ایجوکیشن ان مڈیول انڈیا: ۲۶

تاریخ میں ایسے علماء وفضلاء کی کمی نہیں، جنھوں نے کسی مکتب یا مدرسے کا منھ بھی نہیں دیکھا تھا اس کے باوجود وہ مکتبوں اور مدرسوں میں تعلیم پانے والوں سے سبقت لے گئے۔ تاریخ طاہری کے مصنف نے مولانا اسحاقی سے اور "منتخب التواریخ" کے مصنف عبدالقادر بدایونی نے مہر علی بیگ سے گھر ہی پر تعلیم حاصل کی تھی۔ کئی دوسرے فضلائے زمانہ کی طرح ابوالفضل اور فیضی نے بھی گھر ہی پر تعلیم پائی تھی[1]۔

اتالیق:

پادشاہ، امراء اور مرفہ الحال خاندانوں کے لوگ اپنے شاہزادوں اور بچوں کے لیے، اور خاص طور پر لڑکیوں کے لئے اتالیق مقرر کرتے تھے۔ یہ اتالیق طالب علم کے گھر پر پڑھانے آتے تھے۔ مثال کے طور پر کچھ اتالیقوں کے نام دیکھیے[2]:

شاہزادہ	اتالیق
شاہزادہ محمد بن بلبن	امیر خسرو[3]
جونا خان (محمد تغلق)	مولانا اعزالدین اور قتلغ خان[4]
سلطان سکندر لودھی	شیخ بہاء الدین، شاہ جلالی
	عضدالدین (شاعری)[5]
سلطان غیاث الدین ثانی	حمیدالدین ناگوری[6]
سلیم (جہانگیر)	قطب الدین محمد، مرزا عبدالرحیم، شیخ احمد، مولانا میر کلاں ہروی[7]
مراد اور دانیال	ابوالفضل، سعید خاں چغتائی[8]

---

1. ایجوکیشن اِن مسلم انڈیا: ۱۴۷
2. اڈوانسڈ اسٹڈی اِن دی ہسٹری آف میڈیول انڈیا، میڈیول انڈین سوسائٹی اینڈ کلچر: ۱۵۶
3. ایجوکیشن ان مسلم انڈیا: ۱۵۹
4. ایضاً: ۱۶۰
5. ایضاً: ۱۶۲
6. ایضاً: ۱۶۲
7. ایضاً: ۱۷۴
8. ایضاً: ۱۷۴

داراشکوہ	ملا شاہ[1]
اورنگ زیب	سعداللہ خاں، ملا صالح میر محمد ہاشم[2]

ابتدائی تعلیم:

جب بچہ چار سال چار مہینے اور چار دن کا ہو جاتا تو اسے ابتدائی تعلیم کے لئے یا تو کسی مکتب میں بھیج دیا جاتا، یا کسی استاد کے سپرد کر دیا جاتا یا پھر اس کے لئے گھر ہی پر اتالیق مقرر کیا جاتا تھا۔ اسے چاندی کی ایک تختی دی جاتی، جس پر سورہ اقراء لکھی ہوتی۔ بچے سے اسے دہرانے کے لئے کہا جاتا۔ اس طرح تعلیم کی ابتداء ہوتی۔ یہ رسم ''بسم اللہ'' یا رسم مکتب خوانی'' کہلاتی تھی۔ عموماً اس کا دن اور وقت کسی نجومی کے مشورے سے مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ رسم ہندو بھی مناتے تھے، جو'' اپیئن'' کے نام سے جانی جاتی تھی[3]۔

تعلیم کی ابتداء کلمے سے ہوتی تھی۔ پھر الف با کا پڑھنا اور لکھنا سکھایا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ مختلف حروف کا آپس میں ملانا اور چھوٹی عبارتیں لکھوائی جاتیں اور ابتدائی کتابیں پڑھوائی جاتی تھیں[4]۔

اعلیٰ درجوں میں ریاضیات، نجوم، فلسفہ، تواریخ، جغرافیہ، تصوف، منطق اور معقولات جیسے مضامیں کے علاوہ اسلامی تعلیم کے مضامین جیسے منقول، تفسیر، حدیث، فقہ اور اخلاقیات بھی پڑھائے جاتے تھے۔ اول الذکر سبھی مضامین کا ذریعہ تدریس فارسی ہی تھا۔ اس کے علاوہ فن کتابت اور نقاشی پر بھی خاص توجہ دی جاتی تھی[5]۔

نصاب کے بارے میں تفصیل سے تو کچھ نہیں ملتا، البتہ ابوالحسنات ندوی صاحب نے اپنی کتاب'' ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں'' میں فارسی نصاب کے بارے میں جو لکھا ہے حسب ذیل ہے[6]:

---

1. ایجوکیشن ان مسلم انڈیا: ۱۷۵
2. گلمپسز آف مڈیول انڈین کلچر: ۹۷
3. ہسٹری ایجوکیشن آف مسلم انڈیا: ۱۵۶
4. اے سوشل، کلچرل اینڈ اکانومک ہسٹری آف انڈیا: ۱۵۳
5. اڈوانسڈ اسٹڈی ان دی ہسٹری آف میڈیول انڈیا، میڈیول انڈین سوسائٹی اینڈ کلچر: ۱۵۸
6. ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں: ۱۱۹
   گلمپسز آف میڈیول انڈین کلچر: ۹۱

نثر : نسخۂ تعلیمیہ، تعلیمہ، تعلیمیہ عزیزی، دستور الصبیان، انشاے مادھورام، بہاردانش، انوار سہیلی، انشاے فایق، انشاے خلیفہ، رقعات عالمگیری، گلستان، ابو الفضل۔
نظم : کریما، خالق باری، بوستان، یوسف زلیخا، قصاید عرفی، قصاید بدر چاچ، دیوان غنی، سکندر نامہ وغیرہ۔

رسم دستار بندی :

دورہ تعلیم کے ختم ہونے پر خاص تقریب کا اہتمام کیا جاتا تھا، جس میں فارغ التحصیل طلباء اوران کے اساتذہ شرکت فرماتے تھے۔ سادی سی دعوت کے بعد اساتذہ اپنے شاگردوں کے سر پر دستار باندھتے اور آیندہ زندگی میں ان کی کامیابی کے لئے دعائیں مانگتے تھے۔ یہ رسم ''رسم دستار بندی'' کہلاتی تھی۔

یہی رسم آج کل ''کونوکیشن'' کی شکل میں منائی جاتی ہے، جس مین فارغ التحصیل طلباء کو اسناد دی جاتی ہیں۔[1]

تعلیم نسواں :

''اگر ایک آدمی پڑھتا ہے تو وہ خود تعلیم یافتہ ہوتا ہے، اگر ایک عورت تعلیم حاصل کرتی ہے تو پورا گھر تعلیم یافتہ ہوتا ہے'' (نامعلوم)

پہلے عورتوں کی تعلیم کا اتنا رواج نہیں تھا، لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ تعلیم سے محروم رکھا جاتا۔ ان کی تعلیم کے لئے علیحدہ مکاتب اور مدارس بھی ہوتے تھے، لیکن تعلیم کا انتظام گھر ہی پر کیا جاتا تھا۔ ان کی تعلیم میں زیادہ زور اخلاقی، ادبی اور عملی قسم کی تعلیم پر دیا جاتا تھا۔[2]

مغلیہ دور میں بھی تعلیم نسواں کا رواج تھا، شاہی امرا اور مرفہ الحال خاندانوں کی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے گھر پر انتظام کیا جاتا تھا اور درمیانے طبقے کی لڑکیاں، لڑکوں کے ساتھ ہی پڑھتی تھیں۔ بہت سی عورتوں نے نہ صرف تعلیم حاصل کی، بلکہ اپنے پیچھے علمی آثار بھی چھوڑے ہیں۔ ان میں سے بابر کی لڑکی گلبدن (۱۵۲۳-۱۶۰۳ء) بیگم نے ''ہمایوں نامہ'' لکھا، ہمایوں کی برادرزادی سلیمہ سلطان نے بہت سی فارسی نظمیں اور دیوان مخفی چھوڑا ہے۔ ان کے علاوہ نور جہان، ممتاز محل (۱۵۹۲-۱۶۳۱ء)، جہاں آرا بیگم (۱۶۱۴-۱۶۸۷ء) اور اورنگزیب کی بیٹی زیب النساء زینت معقول حد تک تعلیم یافتہ

---

[1] الایف انڈ کلچر ان میڈیول انڈیا: ۲۴۰

[2] ایجوکیشن ان مسلم انڈیا: ۸

تھیں اور انھوں نے فارسی اور عربی کا خاصا مطالعہ کیا تھا۔ زیب النساء (۱۶۳۹-۱۷۰۹ء) فارسی میں شعر کہتی تھی۔ اور مخفی بھی تخلص کرتی تھی دیوان مخفی ان کے نام سے بھی منسوب ہے۔ زیب المنشات بھی انکی تصنیف ہے۔ کتابت میں بھی مہارت رکھتی تھی۔ اس کا بہت بڑا ذاتی کتابخانہ تھا۔ اس نے ایک اکادمی بھی قائم کی تھی[1]۔

ہندوستان اور اسلامی تعلیم:

اب تک کے مطالعے سے جہاں یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اسلامی تعلیم ہر چھوٹے بڑے، غنی اور فقیر کے لئے یکساں مہیا کی جاتی تھی، وہیں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اسلامی تعلیم کا نظام سیکولر نہیں تھا[2]۔ اسلامی تعلیم کا ڈھانچہ ہی کچھ اس طرح کا تھا کہ غیر مسلم کے لئے تعلیم کی گنجائش ہی نہ تھی۔ اول تو یہ کہ اکثر مکتب اور مدارس مساجد اور خانقاہوں کے اندر ہوتے یا کم سے کم ان سے متصل ہوتے تھے۔ جہاں غیر مسلم کا جانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ دوسرے یہ کہ تعلیمی نصاب کسی طرح بھی ہندوؤں کی تہذیب اور تمدن کے درخور نہیں تھا۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ مسلمان مسجدوں میں مولویوں سے عربی اور فارسی پڑھتے تھے اور ہندو مندروں میں پنڈتوں سے سنسکرت پڑھتے[3]۔ لیکن چونکہ اس زمانے میں رسمی زبان فارسی تھی، اس لیے عربی و فارسی پڑھے لکھے مسلمانوں کو تو سرکاری اداروں اور شاہی درباروں میں نوکری بآسانی مل جاتی تھی۔ جب کہ ہندوؤں کو عربی و فارسی نہ جاننے کی وجہ سے یہ سہولت نہیں تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی اقتصادی اور اجتماعی حالت شبانہ روز ترقی کرنی گئی[4]۔

ہندوؤں میں سب سے پہلے کایستھوں نے اسکندر لودھی (۱۴۸۸-۱۵۱۷ء) کے زمانے میں اپنے بچوں کو مکتب میں بھیجنا شروع کیا۔ اس میں حکومت نے نہ صرف ان کی حوصلہ افزائی کی، بلکہ ان کو کچھ سہولتیں بھی مہیا کیں۔ مثلاً ہندوؤں کو صبح کی دعا اور دوسرے مذہبی رسوم میں حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ رفتہ رفتہ اکبر کے زمانے میں ہندوؤں کو بھی مکتب اور مدرسے میں جانے کا پورا حق مل گیا اور وہ

---

1. این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا: ۵۷۲
2. پنجاب انڈر دی سلطانز: ۱۶۹
3. ایضاً: ۱۶۹
4. ایجوکیشن ان میڈیول انڈیا: ۱۲

مسلمانوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر تعلیم حاصل کرنے لگے[1]۔

راجہ ٹوڈرمل (متوفی: ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۵-۱۶۶۶ء) نے ہندوؤں کے لئے فارسی پڑھنا ضروری قرار دے دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں نے اسی جوش وخروش سے فارسی پڑھنا شروع کردی جس طرح آج کل انگریزی پڑھتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہندوؤں نے فارسی زبان پڑھی اور لکھی، بلکہ انہوں نے اس زبان کے تمام علمی اور ادبی شعبوں پر کامل قدرت حاصل کرلی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہندوؤں میں فارسی زبان کے متعدد نامور ادیب، شاعر اور مصنف پیدا ہوئے[2]۔

ہندوؤں کی فارسی تصانیف:

تاریخ[3]:

چہار چمن۔	چندر بھان برہمن۔	۱۰۵۷/۱۶۴۷ء
راجاولی۔	بنوالی داس دلی	۱۰۶۰ھ/۱۶۴۹ء
گوالیار نامہ۔	منشی ہیرامن	۱۰۷۸ھ/۱۶۶۷ء
لب التواریخ	بندرابن داس	۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء
خلاصۃ التواریخ	سجان رائے بٹالوی	۱۱۰۷ھ/۱۶۹۵ء
فتوحات عالمگیری	ایشر داس ناگر	۱۱۰۹ھ/۱۶۹۷ء
منتخب التواریخ	جگجیون داس	۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء
دل کشا	بھیم سین	۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء
تاریخ مرہٹہ	دھونکل سنگ منشی	۱۱۲۱ھ/۱۷۰۹ء
تاریخ کشمیر	نرائن کول	۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ء
عبرت نامہ	کامراج	۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء

---

[1] ایجوکیشن ان مسلم انڈیا: ۵۸

[2] ایجوکیشن ان مسلم انڈیا: ۸۶

[3] ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ: ۸۰-۸۲

تذکرے[1]:

بھگت مالا	نوبت رام سونی خوشابی	۱۱۱۳ھ/۱۷۰۱ء
ہمیشہ بہار	کشن چند اخلاص	۱۱۳۶ھ/۱۷۲۳ء
سفینہ خوشگو	بندرابن داس خوشگو	۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء
سفینہ عشرت	درگاداس عشرت	۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء
انیس الاحبا	موہن لال انیس	۱۱۹۷ھ/۱۷۸۲ء
گل رعنا	شفیق اورنگ آبادی	
شام غریباں	شفیق اورنگ آبادی	
چمنستان شعراء	شفیق اورنگ آبادی	
سفینہ ہندی	بھگوانداس ہندی	۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء
تذکرہ حدیقہ ہندی	بھگوانداس ہندی	۱۲۰۰ھ/۱۷۸۵ء

لغات[2]:

گنج لغات	گردھاری لال
شیر وشکر	پنڈت گنگابشن
مصطلحات الشعراء	سیالکوٹی مل
بہار عجم	ٹیک چند بہار

انشا[3]:

انشائے ہرکرن	ہرکرن	۱۰۳۱ھ/۱۶۲۱ء
انشائے مادھورام	منشی مادھورام	۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء
طراز الانشاء	اندر جیت محقر	۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء

---

[1] ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ: ۱۳۴

[2] ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں: ۱۱۴

[3] ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ: ۱۳۸

گلدستۂ فیض	تھوری مل نمکین	۱۱۳۹ھ/۱۷۲۶ء
گلشن عجائب	رائے سنگھ منشی	۱۱۲۹ھ/۱۷۱۶ء
مسودات کیول رام	کیول رام	۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء
غریب الانشأ	کشن سنگھ نشاط	۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء
رقعات مخلص	آنند رام مخلص	۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰ء
نیاز نامہ	سجان رائے پوری	
بہار نثر	آیا مل	۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء
خلاصۃ الانشأ	لچھمی رام دہلوی	۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء
منتخب الحقائق	امیر چند منشی	۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء

قصص و حکایات[1]:

فرح بخش	لچھمی رام ابراہیم آبادی	۱۱۳۵ھ/۱۷۲۲ء
داستان لال پری	رنجیت رائے	۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء
رنگین بہار	کرپادیال	۱۱۵۵ھ/۱۷۴۲ء
ہیر رانجھا	منسارام منشی	۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء
قصہ نوروز شاہ	اودت چند عزیز کایستھ	۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء
نخلستان	شفیق اورنگ آبادی	۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ء
پرورتی نرورتی	لالہ رنجیت	۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء

علوم الحساب[2]:

دستور الحساب	اندرمن منشی	۱۱۸۰ھ/۱۷۶۶ء
زبدۃ القوانین	ہرسکھ رائے	۱۲۱۱ھ/۱۷۹۶ء
مجمع الحساب	گھاسی رام	۱۲۰۲ھ/۱۷۸۷ء
رسالہ حساب	انندرام کایستھ	

---

[1] ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ: ۱۴۵

[2] ایضاً: ۱۴۸

ہیئت و نجوم[1]:

جواہر الافلاک	جواہر سنگ	
حدائق النجوم	رتن سنگ زخمی	۱۲۵۳ھ/۱۸۲۷ء
کاشف الدقائق	کیول رام کول	
رسالہ نجوم	بیربل	
مفتاح الناظرین	رام پرشاد	
زیج اشکی	کندل لال اشکی	

طب[2]:

معیار الامراض	رام پرشاد
مفردات طب	منولال فلسفی
مجربات تمکین	بجھولال تمکیں
ضروری الطب	منشی مہتاب نراین

اس مختصر بیان سے صاف ظاہر ہے کہ فارسی کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو، جس میں ہندوؤں نے گرانبہا کارنامے انجام نہ دئے ہوں۔ غرض سکندر لودی کے زمانے سے ہندوؤں میں جو فارسی پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا وہ آج تک جاری ہے۔ دور حاضر میں بھی بہت سوں کے علاوہ ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ، ڈاکٹر ستیا نند جاوا، جناب بانکے بہاری لعل، جناب مہتاب نارائن ماتھر، ڈاکٹر سدارنگانی، پروفیسر بھگوت سروپ، جناب صابر ابوہری، جناب دیانند سوامی، شری وجے کمار اور ڈاکٹر چندر شیکھر ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے فارسی کی بڑی مستعدی سے خدمت کی ہے اور کر رہے ہیں۔

---

[1] ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ: ۲۴۸

[2] ایضاً: ۲۴۹

باب سوم

ہریانہ میں فارسی زبان

مورخین اور ماہرین لسانیات مانتے ہیں کہ ہندوستان میں فارسی زبان محمود غزنوی کے حملے (۳۹۱ھ/۱۰۰۱ء) کے ساتھ آئی[۱]۔ تھانیسر، ھریانہ کا وہ سب سے پہلا شہر ہے، جسے اس نے ۴۰۲ھ/۱۰۱۱ء میں برباد و ویران کیا[۲]۔ اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ ہریانہ مین فارسی زبان ۱۰۱۱ء میں آئی۔

ہریانہ و فارسی زبان کی ترویج:

موجودہ ہریانہ، یکم نومبر ۱۹۶۶ء سے پہلے پنجاب ہی کا ایک حصہ تھا۔ اس کے باوجود فارسی جس قدر پنجاب میں رائج ہوئی اتنی ہریانہ میں رائج نہیں ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ محمود غزنوی اور اس کے پانچ سو سال بعد مغلیہ سلطنت کا بانی ظہیرالدین بابر (۱۴۸۳-۱۵۲۶ء) پنجاب کے راستے ہندوستان آیا۔ اس لئے پنجاب، ہندوستان کے باقی صوبوں کے مقابلے میں زیادہ مدت کے لئے اسلامی تہذیب کے زیر اثر رہا۔ اس کے برعکس ہریانہ کے علاقے میں اسلامی اثر کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی مخصوص جگہ پر بارش ہونے پر آس پاس کے خطے مین بھی تھوڑی سی خنکی ہو جاتی ہے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ پنجاب کا شہر لاہور نہ صرف یہ کہ سلطنت اور مغلیہ دور میں صوبائی دارالخلافہ رہا، بلکہ غزنوی خاندان کے بعض بادشاہوں کے دور مین یہ پورے ہندوستان کا بھی پایہ تخت تھا۔ اس لئے جتنی بھی تعلیمی ترقی ہوئی، لاہور اور اس کے گرد و نواح کے علاقے میں ہوئی، جس سے لاہور، ملتان، سیالکوٹ، پشاور

۱۔ دی دہلی سلطنت: ۵۳۳؛ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں: ۱۷۔ لائف اینڈ کلچر ان مڈیول انڈیا: ۳۱۹

۲۔ ہریانہ کا اتہاس: ۲:۳۱۹؛ تاریخ فرشتہ: ۱:۵۳؛ ہسٹری آف دی رائز آف دی محمڈن پاور ان انڈیا: ۵۰

بلکہ سندھ، بہت بڑے تعلیمی مرکز بن گئے[1] مسعود بن محمود غزنوی (۱۰۳۰-۱۰۳۹ء) کے عہد میں لاہور میں سب سے پہلا عربی اور فارسی کا مدرسہ قائم ہوا[2]، اور اس کی فوج کا سپہ سالار (ایک ھزاری) تلک وہ پہلا ہندوستانی تھا، جس نے اپنے ایک ہزار ساتھیوں کے ساتھ فارسی زبان سیکھی[3]۔

اگرچہ محمد غوری (م:۱۲۰۶ء) کے زمانے میں ہندوستان کا پایہ تخت لاہور سے دلی منتقل ہو گیا تھا[4] اور پھر اس کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ (م: ۲۷ جون ۱۸۳۹ء) کے عہد تک پنجاب میں کوئی بادشاہ نہیں ہوا، لیکن صوبائی امراء نے تعلیم کی تبلیغ و ترویج میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ناصر الدین قباچہ (۱۲۰۵ء-۱۲۲۷ء) اور شاہ ارغنون (م:۱۵۵۶ء) نے سندھ میں مدرسے قائم کئے[5] غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶ء-۱۲۸۷ء) نے سلطان نصیر الدین (۱۲۴۶ء - ۱۲۶۶ء) کی یاد میں دار العلوم کے نام سے جالندھر میں ایک مدرسہ قائم کیا، جس کا مدیر اعلیٰ ''طبقات ناصری'' کا مصنف منہاج السراج تھا۔ اس مدرسے کا نام ''ناصریہ'' رکھا گیا تھا[6]۔

ملتان اور لاہور کا گورنر شاہزادہ محمد بن بلبن (۱۲۶۶-۱۲۸۶ء) پنجاب میں تعلیم کے فروغ کے لئے ہمیشہ کوشاں رہا۔ اس کے دربار میں ہمیشہ علماء، فضلاء اور شعراء کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اس کا دربار، دربار کم اور بزم سخن زیادہ نظر آتی تھی۔ فخر کی بات یہ تھی کہ یہ مجلسین امیر خسرو (۶۵۱-۷۲۵ھ / ۱۲۵۳-۱۳۲۴ء) کی سرپرستی میں منعقد ہوتی تھیں[7]۔

صوبہ ملتان میں تعلیم کی اشاعت کے لئے ''حسین شاہ لنگا'' اور حسن مرزا لنگا (۱۴۷۰-۱۵۰۳ء) نے قابل تحسین سرگرمی دکھائی اور بہت سے مدارس قائم کئے[8]۔

۱۔ اے سوشل کلچرل اینڈ اکانومک ہسٹری آف انڈیا: ۱۵۴-۵۵
ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں: ۱۵، ۲۷، ۷۳۔
ایجوکیشن ان میڈیول انڈیا: ۳۵-۳۶

۲۔ اڈوانسڈ اسٹڈی ان دی ہسٹری آف میڈیول انڈیا، میڈیول انڈین سوسائٹی اینڈ کلچر: ۱۵۹

۳۔ پنجاب انڈر دی سلطانز: ۱۷۱

۴۔ گلمپسز آف میڈیول انڈین کلچر: ۷۲؛

۵۔ اڈوانسڈ اسٹڈی ان دی ہسٹری آف میڈیول انڈیا، میڈیول انڈین سوسائٹی اینڈ کلچر: ۱۵۹؛ ایجوکیشن ان میڈیول انڈیا، ۱۷؛ ایجوکیشن ان مسلم انڈیا: ۶۰؛ تاریخ فرشتہ: ۲: ۹۰۷

۶۔ گلمپسز آف میڈیول انڈین کلچر: ۷۳

۷۔ پنجاب انڈر دی سلطانز: ۱۶۷؛ ایجوکیشن ان مسلم انڈیا: ۴۳

۸۔ پنجاب اندر دی سلطانز: ۱۶۸؛ ایجوکیشن ان میڈیول انڈیا: ۱۷

مغلیہ دور میں بھی بدستور پنجاب تعلیم کا مرکز رہا۔ شاہجہاں کے زمانے میں (۱۶۲۷-۱۶۵۸: م: ۱۶۶۶ء) لاہور اور سرہند اور اس کے بعد اورنگزیب کے عہد حکومت میں سیالکوٹ تعلیم کے مشہور مرکز تھے[1]۔

بہت حد تک یہ ساری سرگرمی پنجاب تک محدود رہی، اور ہریانہ اس سے فیضیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ اس کو کسی سلطان یا مغل بادشاہ، یا پھر ان کے کسی علم دوست امیر کی سرپرستی نصیب نہیں ہوئی۔ یوں کہنے کو تو اس وقت کے ہریانہ کے علاقے میں کم و بیش ۱۳ ریاستیں تھیں، لیکن اول تو یہ ریاستیں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں اور ان کی آمدنی بہت محدود تھی۔ دوسرے یہ کہ ان ریاستوں کے نواب یا راجاؤں میں سے کسی کو، ماسوائے خاندان لوہارو کے علم و ادب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ چونکہ ہریانہ دلی کے نزدیک ہے، اس لئے تقریباً یہ بھی نواب اور راجے اکثر دلی میں رہتے تھے۔ انہیں اپنی ریاست کی دیکھ بھال یا ترقی کی فرصت ہی نہیں تھی۔ اس باعث نہ ہریانہ میں فارسی کا کوئی خاص تعلیمی مرکز قائم ہوا اور نہ ہی فارسی کے شعراء یا علماء و فضلاء کو حکومت کی سرپرستی نصیب ہوئی۔ سرپرستی کے نام پر دو چار نام ایسے ملتے ہیں جو ان ریاستوں کے درباروں سے وابستہ تھے۔ رشید الدین فائز نارنولی (۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء-۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء) کو، جو اردو فارسی کے شاعر تھے، نواب عبدالرحمٰن خان والی جھجر نے شاہی خاندان کے افراد کی تعلیم کے لیے جھجر بلوایا، یہ کچھ مدت تک وہاں رہے لیکن کسی بات پر نواب صاحب سے اختلاف ہو جانے کی وجہ سے ملازمت ترک کر کے چلے گئے[2]۔ محمد غلام خان تپش اکبر علی خان والی پٹودی کے دربار کے شاعر تھے۔ تپش[3] غالب کے شاگرد تھے۔

ہریانہ میں سرپرستی کا فقدان ہونے کی وجہ ہی سے ہریانہ کے بیشتر علماء و فضلاء کو ہریانہ چھوڑ کر دلی، لکھنؤ، حیدرآباد یا دوسری جگہوں پر جانا پڑا۔ قمرالدین منتؔ، امام بخش صہبائیؔ اور الطاف حسین حالیؔ وغیرہ سبھی کو ہریانہ سے باہر پناہ لینی پڑی۔

اس کے باوجود ضلع اور امپیریل گزٹیر اور لائٹز کی انگریزی کتاب ''ہسٹری آف انڈجینس ایجوکیشن ان دی پنجاب'' سے معلوم ہوتا ہے کہ ہریانہ میں مکاتب اور مدارس کی خاصی تعداد تھی۔ مختلف تذکروں میں ہریانہ کے اصفیا، علما، و فضلاء اور شعراُ کے ناموں اور ان کی فارسی تصانیف کی

---

[1] اجوکیشن ان میڈیول انڈیا: ۲۲؛ ایجوکیشن ان مسلم انڈیا: ۱۳۹

[2] تذکرہ شعرائے جے پور: ۳۵۰۔ لیکن تاریخ جھجری میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے

[3] تلامذہ غالب: ۱۰۹

بڑی تعداد بھی اس بات کی گواہ ہے کہ ہریانہ میں فارسی کا قابل ذکر رواج تھا۔ جب کبھی ہندوستان کے فارسی مراکز کا ذکر ہوتا ہے تو ان میں تھانیسر، نارنول اور انبالہ کا نام بھی خاص طور پر لیا جاتا ہے۔ یہ تینوں قدیم شہر ہریانہ ہی کے ہیں[1]۔ ان کے علاوہ پانی پت، حصار اور ہانسی بھی فارسی کے اہم مرکز رہے ہیں۔

۱۸۳۷ء میں فارسی کی جگہ انگریزی رسمی زبان قرار پائی[2]۔ شروع میں انگریزی پڑھنے والوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا، بلکہ انگریزی مدرسے ''مچھلے'' کہلاتے تھے[3]۔ فارسی کو انگریزی کی وجہ سے زبردست دھکا لگا۔ فارسی جو پچھلی آٹھ صدیوں سے سبھی علوم کے پڑھنے پڑھانے کا ذریعہ تھی، صرف اختیاری مضمون ہو کر رہ گئی۔ لیکن مُروّج فارسی کا اثر اور ماحول اتنی طویل مدت تک اور اس حد تک لوگوں کے دل و دماغ پر طاری رہا کہ انگریزی کے بعد، غیر مسلم تک ہندی، سنسکریت اور اردو کے مقابلے میں فارسی پڑھنے کو ترجیح دیتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران ہریانہ کے بعض نوابوں اور راجاؤں نے انگریزوں کے خلاف بڑی سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔ جس کی وجہ سے انگریز ہریانہ سے سخت ناراض تھے۔ جھجر کے علم دوست نواب عبدالرحمٰن خان، بلب گڑھ کے راجہ ناہر سنگھ، دونوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور ہریانہ کے بیشتر علاقے سکھ راجاؤں کو عطا کر دیے گئے لیکن سکھ راجاؤں کو بھی علم کی ترویج سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے حالات تبدیل ہو جانے پر بھی ہریانہ میں فارسی کا کوئی فروغ نہ ہوا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ۱۸۳۷ء میں انگریزی کی تعلیم کے آغاز نے ہندوستانی دیسی تعلیم کو (جس میں ہریانہ بھی شامل تھا) بہت نقصان پہنچایا، لیکن چونکہ فارسی کی یہاں جڑیں بہت گہری تھیں، اس لئے کسی نہ کسی طرح اس کا وجود قائم رہا۔ یہ صورت آزادی ملک تک قائم رہی، لیکن ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک نے ہریانہ سے فارسی کا نام و نشان مٹا دیا۔ ۱۹۴۷ء میں ہریانہ پوری طرح فارسی پڑھنے والوں سے خالی ہو گیا۔ ماسوائے میوات کے علاقے کے، جہاں آج بھی کچھ فارسی داں مسلمان مل جاتے ہیں۔ یوں ہریانہ سے فارسی کا رواج اٹھ گیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد فارسی شاید ہی ہریانہ کے کسی اسکول، کالج یا یونیورسٹی

۱۔ ایجوکیشن ان میڈیول انڈیا: ۲۲؛ گلمپسز آف میڈیول انڈیا ز کلچر: ۷۷؛ ہندوستان کی قدیم درسگاہیں: ۳۰؛ ہسٹری آف انڈیجینس ایجوکیشن ان دی پنجاب: ۱۵۸؛ پروموشن آف لرننگ ان انڈیا ڈیورنگ محمڈن رول: ۱۳۶

۲۔ مسلمز انڈ چینز نگ انڈیا: ۵۵،

۳۔ یادگار حالی: ۲۸

میں پڑھائی گئی ہو[1] البتہ ہریانہ کے کچھ لوگ ذاتی دلچسپی کے باعث پنجاب یونیورسٹی (سولن۔ چنڈی گڑھ) سے منشی، منشی عالم ومنشی فاضل وغیرہ کا امتحان ضرور دیتے رہے ہیں۔

عجیب اتفاق ہے کہ جب ہریانہ کے علاقے میں فارسی کا رواج تھا تو اس وقت ہریانہ مستقل طور پر وجود ہی میں نہیں آیا تھا، اور جب ہریانہ مستقل طور پر وجود میں آیا (یکم نومبر ۱۹۶۶ء) تو یہاں سے فارسی کا رواج اٹھ گیا۔

ہریانہ میں فارسی مراکز:

انبالہ:

یہ ہریانہ کا بہت پرانا اور تاریخی شہر ہے، یہ گھگر اور سرسوتی دریاؤں کے دوآبے میں، شیرشاہ سوری سڑک کے کنارے جنوب میں بسا ہوا ہے۔ چودھویں صدی عیسوی میں انبا نام کے راجپوت راجا نے اس شہر کا سنگ بنیاد رکھا تھا[2]۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ پہلے اس کا نام ''انباں والا'' تھا[3]، کیوں کہ یہاں کسی زمانے میں چپے چپے پر آموں کے باغ تھے۔ بعد میں یہی انباں والا بگڑ کر انبالہ ہوگیا، آج انبالہ ایک صنعتی شہر ہے۔ اس میں تقریباً ساڑھے چارسو (۴۵۰) چھوٹے بڑے کارخانے ہیں۔ پورے ملک کی سائنسی سامان کی ایک تہائی ضرورت اسی شہر سے پوری ہوتی ہے[4]۔

محمد صادق اور شاہ لطف اللہ یہاں کے مشہور عالم و فاضل اور شیخ حسین اور محمد سعید یہاں کے مشہور اصفیا میں شمار ہوتے ہیں۔

پانی پت:

پانی پت، دلی سے ۹۰ کیلومٹر شمال میں جرنیلی سڑک پر آباد ہے۔ اس کا قدیم نام ''پانی پتھ''[5] بتایا جاتا ہے، جو آریوں سے بھی قبل یہاں پر بسے ہوئے ایک راجہ ''دنڈ پانی'' کے نام پر رکھا گیا تھا۔ یہ بھی

---

[1] حال ہی میں پڑھنے میں آیا ہے کہ دیال سنگھ کالج کرنال میں اپریل ۱۹۶۰ تک فارسی پڑھائی جاتی رہی ہے: جمنا تٹ: جلد نمبر ۴ (شمارہ نمبر ۱)، ۱۹۹۰: ۱۶

[2] انبالہ ڈسٹرکٹ گجیٹر: ۲۱۷؛ امپیریل گجیٹر: ۵: ۲۷۶؛ پنجاب انڈر سلطانز: ۱۹۷؛ جمنا تٹ: ج: ۵: شمارہ ۲: ۱۹۹۱؛

[3] جمنا تٹ: جلد نمبر ۵، شمارہ ۲: ۲۸؛ ہریانہ: ۹۰

[4] خبرنامہ: جنوری-فروری ۱۹۹۲: ۲

[5] ہریانہ کا اتہاس: ۱: ۲۴۰؛ ہریانہ؛ ایک سانسکرتک ادھین: ۲۶

کہا جاتا ہے کہ اس شہر کو پانڈوؤں (ارجن[1]) نے بسایا تھا۔ اس شہر کی قدمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا ذکر مہابھارت میں ملتا ہے، شری کرشن نے کوروؤں سے جو پانچ گاؤں پانڈوؤں کے لئے مانگے تھے وہ شری پت، باغپت، تال پت، سون پت اور پان پت تھے[2]۔

موجودہ پانی پت پورے ہندوستان مین ہینڈلوم نگر کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے یہ صرف کمبلوں کے لئے مشہور تھا۔ مگر آج یہاں کی بنی ہوئی دریاں، غالیچے۔ پردے، چادریں وغیرہ نہ صرف ہندوستان مین بلکہ بیشتر بیرونی ممالک میں بھی مشہور ہیں۔ یہاں پرانے شہر کے گھر گھر یں کھڈی کا کام ہوتا ہے، جن کا تیار کردہ مال بیرونی ملکوں کو بھیجا جاتا ہے، جس سے تقریباً ۸۰ کروڑ روپے کا زر مبادلہ حاصل ہوتا ہے[3]۔

اسی شہر کی سرزمین پر بابر اور ابراہیم لودھی (۱۵۲۶ء)، اکبر اور ہیمو بقال (۱۵۵۶ی)۔ احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں (۱۷۶۱ء) کے درمیان فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ اس شہر کی تاریخی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے ذکر کے بغیر ہندوستان کی تاریخ مرتب ہی نہیں ہو سکتی۔

پانی پت کی ادبی اہمیت کے بارے میں بھی یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس کے ذکر کے بغیر فارسی اور اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنا ناممکن ہے۔

پانی پت کے خواجہ الطاف حسین حاؔلی، سعد اللہ مسیحائی، شرف الدین بوعلی قلندر، محمد جعفر خان راؔنب، مُلا طاہر، غلام حسین خاں خیاؔلی، قادرؔی، میر قاسم علی قاسم، قلندر بخش تراؔبی، حافظ قلندر بخش زیرک نے اپنی فارسی شاعری سے، محمد بن محمد، محمد علی انصاری، عبدالرحمٰن، شیخ امان اللہ، عنایت خاں راسخ، قاضی ثناء اللہ عثمانی نے فارسی نثر سے اور محمد اکبر لاولیا، خواجہ شمس الدین ترک، مولانا عبدالغفور اداری، قاضی عبدالقادر اور شیخ مودودلاری نے اپنے پندو وعظ سے فارسی ادب کی گرانبہا خدمات انجام دی ہیں۔

تھانیسر:

اگر روایت پر اعتبار کیا جائے تو ہندوؤں کی مقدس کتاب ''گیتا'' کوروکشیتر میں وجود میں آئی۔ ترتسوں کے راجہ ''شیام ورن'' کو سورج کی دختر نیک ''تاپتی'' سے محبت ہوگئی، وشِشٹ کے کہنے پر

---

[1] جمناتٹ: جلد نمبر ۲ شمارہ نمبر ۳ اور ۴: ۱۹۸۹: ۱۴۲

[2] جمناتٹ: جلد نمبر ۳ شمارہ نمبر ۳-۴: ۸۱: ۱۹۸۹؛ ہریانہ: ۸۹

[3] جمناتٹ: جلد: ۳، شمارہ: ۳-۴: ۱۷۱، ۱۹۸۹

ان دونوں کی شادی کردی گئی ان کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام ''کورو'' رکھا گیا اور اس شہر کا نام کروکشیتر رکھا گیا[1]۔ کورکشیتر، تھانیسر کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ ہریانہ کا ایک اہم ضلع اور بہت ہی قدیم شہر ہے۔ تھانیسر ساتویں صدی مین راجا ہرش وردھن کا پایۂ تخت ہوا کرتا تھا، گیارہویں صدی میں محمود غزنوی نے اسے ویران کردیا۔ دور وسطی مین تھانیسر اسلامی تہذیب کا بہت بڑا مرکز رہا ہے۔

تھانیسر ہندوؤں کی بہت مقدس زیارتگاہ ہے، آج بھی اس کے اردگرد آٹھ میل کے دائرے میں ۳۶۵ زیارتگاہیں ہیں ۱۱ جنوری، ۱۹۵۶ء میں یہاں یونیورسٹی قائم ہوئی[2]۔

امام بخش صہبائی، مولانا احمد، لالہ حکیم چند ندرت، ملا نسبتی، عبدالوہاب وحشت، تھانیسر کے مشہور فارسی شعرا ہوئے ہیں۔ علماء میں شیخ جلالی، عبدالعزیز، محمد بن شیخ ضیا، حاجی محمد سلطان، حاجی غلام مصطفیٰ، نظام الدین احمد نے شہرت حاصل کی ہے۔ اور مولوی مراد اللہ کا اصفیا میں شمار ہوتا ہے۔

حصار:

یہ شہر حصار فیروزہ یا قلعہ فیروزہ کے نام سے مشہور تھا حصار، ''اِشوکار''[3] کا بگڑا ہوا نام بتایا جاتا ہے، اس شہر کی بنیاد فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱-۱۳۸۸ء) نے ۱۳۵۶ء میں رکھی تھی[4]۔ یہاں کی جامع مسجد اور فیروز شاہ کا محل اس زمانے کی داستان سنانے کو اب تک موجود ہیں۔ پرانے تاریخی آثار میں مسجدِ بہلول، مقبرہ چلس حافظ، ستون اشوک وغیرہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں[5]۔

شاہجہان (۱۶۲۷-۱۶۶۶ء) نے ممتاز محل (م ۱۶۳۱ء) کی یاد میں روضہ تاج محل تعمیر کیا تھا۔ اس سے تین سو سال پہلے فیروز شاہ تغلق نے اپنی لاڈلی ہندو بیگم ''گوجری'' کے لیے ''گوجری محل'' تعمیر کیا تھا، جس کے کھنڈرات حصار میں آج تک ان کی محبت کی داستان دہراتے ہیں[6]۔

حصار ہریانہ کے اہم فارسی مراکز مین سے ہے، یہاں حسب ذیل شعراء اور علماء اصفیا نے فارسی میں نام پیدا کیا:

---

[1] ہریانہ کا اتہاس: ۱: ۹۰

[2] ہریانہ کا اتہاس: ۱: ۹۰

[3] ہریانہ: انسینٹ انڈ میڈیول: ۳۱؛

[4] ہریانہ: ۹۲

[5] ہمارے دیش راجیہ: ہریانہ: ۴۸

[6] ہسٹری آف حصار: ۳۶؛

شعراء : عیشی (مختی) حصاری، گھمنڈی لال عاشق

عالم : بالکرشن برہمن

اصفیا و مشائخ: شیخ آدھو، شیخ جنید، عبدالعزیز

نارنول:

نارنول دلی کے جنوب مغرب میں ۸۴میل اور ریواڑی سے ۳۷ میل کی دوری پر واقع ہے۔
اس شہر کو کس نے اور کب بسایا اور اسکی وجہ تسمیہ کیا ہے، اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔
بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ''راجہ لون کرن'' نے اپنی اہلیہ نارنول کے نام پر اس شہر کا نام نارنول رکھا تھا[1]۔ دوسرے کہتے ہیں کہ ناہر (یعنی شیر) اور نول (یعنی خوف) کی وجہ سے اس کا نام نارنول پڑا اس شہر کا نام بیربل سے بھی جوڑا جاتا ہے۔

گرڈک کا حوالہ دیتے ہوئے غلام یزدانی نے بھی اپنے ایک مقالے ''نارنول اور اس کی عمارتیں'' میں چند وجہ تسمیہ نقل کی ہیں جو حسب ذیل ہیں:

۱۔اس کا نام ناہرنول تھا، یعنی ''شیروں کا جنگل'' اس علاقے میں شیر فراوانی سے پائے جاتے تھے۔
۲۔اس کا نام نارنول تھا۔ مقامی زبان میں ''نار'' کے معنی عورت کے ہیں اور ''نول'' کے معنی ہیں خوبصورت۔ کیونکہ یہاں کی عورتیں بہت خوبصورت ہوتی تھیں، اس لئے اس کا نام نارنول پڑا۔
۳۔جب اس شہر کی بنیاد ڈالی جارہی تھی تو دیکھا کہ ایک سانپ اور نیولے میں لڑائی ہو رہی ہے۔ اس لئے اس شہر کا نام ناگ سے بگڑ کر نار اور نیولے سے بگڑ کر نول، یعنی نارنول پڑا[2]۔

غلام یزدانی کے مطابق اس شہر کا بانی، میواڑ کا گوہیلا شاہزادہ ''نرواہنا'' تھا اور نرواہنا ہی سے بگڑ کر اس شہر کا نام ''نارنول'' پڑا۔ غلام یزدانی لکھتے ہیں— میرا قیاس اس روایت پر مبنی ہے کہ نارنول ایک تاریخی نام ہے۔ ابجد ہوز کے لحاظ سے اس حرف کے ۳۳۷ عدد بنتے ہیں، یعنی ۳۳۷ ہجری، جو برابر ہے ۹۴۹عیسوی کے۔ ''نرواہنا'' بھی تقریباً ۹۴۹ء ہی میں ہوا تھا[3]۔

یہ شہر مغلیہ دور میں جے پور کے تحت تھا۔ انگریزوں نے اسے نواب جھجر کے حوالے کر دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جب نواب جھجر عبدالرحمٰن خاں کو پھانسی کی سزا (۲۳دسمبر ۱۸۵۷ء) ہوگئی تو

۱۔ پنجاب انڈر دی سلطانز: ۲۰۰؛ امپیریل گزٹیئر: ج: ۱۸: ۳۸۰

۲-۳۔ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال: ج: ۳: شمارہ ۸: ۵۸۱

انگریزوں نے نارنول اور کانوڈ (جس کا نام بعد میں بدل کر مہندر گڈھ کر دیا گیا) مہاراجہ پٹیالہ نریندر سنگ کو دے دئے[1]۔

نارنول مشہور تجارتی مرکز بھی ہے۔ یہ شہر گھی کی بہت بڑی منڈی ہے۔ یہاں کی حنا پورے ہندوستان میں مشہور ہے۔ اس کا "فسانۂ عجائب" اور نشتر عشق میں بھی ذکر ہے۔

بیربل چھنا، بیربل گنبد، چھنامکند داس اور ابراہیم سور کا مقبرہ، جسے شیر شاہ سوری (۱۵۴۰-۱۵۴۵ء) نے بنوایا تھا۔ یہاں کی بہترین پرانی عمارتیں ہیں۔ ان کے علاوہ شوبھا ساغر تالاب، چندر پوری جل محل وغیرہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں[2]۔

نارنول کے مشاہیر حسب ذیل ہیں:

شعرا: میر شیر علی افسوسؔ، میر جعفر زٹلؔ، احتشام الدین شوکتؔ، رشید الدین فائزؔ، نواب شکر اللہ خان خانی خاکسارؔ، شیخ معین الدین صبورؔ، سید نعمت اللہ، مولوی شیخ کرامت علی اعجازؔ، مولانا عثمان سلیم الدین تسلیمؔ۔

علماء: حمید الدین، عبدالرحمٰن اخوان زادہ، منشی گوبند نراین صبا، ولی محمد۔

اصفیا: شیخ محمد مجد شیبانی، شیخ تاج الدین شیر سوار، شیخ جمال الدین دہرسوئی؛ قاضی شمس الدین شیبانی، شیخ عاشق محمد، سید اعطا اللہ، شیخ فرخ شاہ، شیخ فیض اللہ، مولانا احمد روشن، شیخ محمد ترک، سید میر قاسم، شیخ ہمزہ۔

ہانسی:

"آسی" کا بگڑا ہوا نام ہانسی ہے۔ یہ شمالی ہند کا بہت پرانا شہر ہے اور رہتک- حصار سڑک پر واقع ہے۔ اسے دلّی کے راجا انگ پال نے بسایا تھا۔ ایک ہزار عیسوی میں یہ شہر بسل دیو چوہان کو عطا ہوا۔ محمود غزنوی کے بیٹے مسعود (متوفی: ۴۳۳ھ/۱۰۴۱ء) نے ۱۰۳۶ء میں یہ شہر بسل دیو سے چھین لیا[3]۔

۱۰۴۳ء میں دلی کے حاکم بسل دیو نے اسے واپس لے لیا اگرچہ پرتھوی راج نے اس شہر کو ہر طرف سے محفوظ و مضبوط کرنے کی کوشش کی، اس کے باوجود ۱۱۹۲ء میں محمد غوری نے اس پر قبضہ کر لیا۔

---

[1] ہریانہ اک اتہاس: ۳: ۹۵؛ ڈسٹرکٹ انڈ سٹیٹس گزیٹیر آف انڈو ڈوایڈ پنجاب: ۴: ۱۹۶، ۱۹۸۔

[2] جرنل آف دی ایسیاٹک سوسائٹی آف بنگال: ج: ۳: (۱۹۰۷) ص: ۸۳-۵۸۲

[3] امپیریل گزیٹیر: ج ۱۳: ۲۵

۱۷۸۳ء سے ۱۷۹۸ء تک یہ شہر شدید قحط کا شکار رہا۔ جارج تھامس نے اسے پھر سے بسایا تھا[1]
یہاں کی مشہور و ممتاز عمارتوں میں نظام اللہ قطب جمال الدین علی میر تجارہ کے مقبرے اور شہید گنج مسجد کے علاوہ دو اور مسجدیں ہیں[2]۔
یہاں کے مشاہر میں احمد بن محمد، حضرت شیخ جمال الدین شعرأ ہیں۔ علماء ہیں، محمد بن محمود، شیخ قطب الدین منور، فخر الدین، شیخ نور الدین، شیخ عبدالواسع، شیخ احمد بن بھکن صدیق ہیں اور اصفیا میں برہان الدین، شیخ شہاب الدین خطیب، قطب الدین، منتخب الدین ہیں۔

ہریانہ میں فارسی مکاتیب اور مدارس:

انبالہ شہر:

یہاں دو مدرسے تھے ان میں سے ایک امامیہ مدرسہ تھا جو شیعیوں نے قائم کیا تھا اور دوسرا اسلامیہ مدرسہ تھا جو سنیوں نے قائم کیا تھا۔ اول الذکر مدرسے میں مولوی غلام علی خاں، سید راضی اور مولوی ابراہیم، دوسرے موضوعات کے علاوہ فارسی بھی پڑھاتے تھے۔
اس زمانے کے مخارج کا معیار اس سے معلوم ہو گا کہ تینوں اساتذہ کی ماہانہ تنخواہ بالترتیب ۱۵، ۲۰، اور ۴۰ روپے تھی[3]۔

انبالہ چھاونی:

یہاں ایک مکتب تھا، جس میں مولوی کمال الدین ۱۳ طلبأ کو فارسی پڑھایا کرتے تھے، ان کی تنخواہ ۲۰ روپے ماہانہ تھی[4]۔
اسی حلقے کے دیہات گاٹھڑی، مانپور اور سل میں بھی فارسی پڑھائی جاتی تھی[5]۔
انبالہ ہی کے علاقے دھورلہ اور موکھی میں بھی ایک ایک مکتب تھا۔ یہاں مولوی محمد علی اور مولوی کریم بخش طلباء کو فارسی پڑھاتے تھے[6]۔

۱۔۲ امپیریل گزیٹیر: ج: ۲۵:۱۳
۳ ہسٹری آف انڈیجینس ایجوکیشن ان دی پنجاب؛ ۲۷:۲
۴ ایضاً ۲۷:۲
۵ ایضاً ۲۷:۲
۶ ایضاً ۲۸:۲

بکانا گاؤں کے نمبردار فتح علی کے گھر میں ایک مکتب قائم تھا، اس میں صرف پانچ طلبا تھے جو فارسی (گلستان وغیرہ) پڑھتے تھے۔ فتح علی مدرس کو نقد تنخواہ کی جگہ سال میں دو مرتبہ ۱۲ من دھان دیتے تھے۔[۱]

گمتھلا گاؤں کی مسجد میں بھی ایک مکتب تھا، جس میں ۱۲ طلباء فارسی پڑھتے تھے۔[۲]

یمنا نگر:

جگادھری کے مکتب میں مولوی عبد القادر فارسی پڑھاتے تھے۔ اس کے علاوہ خضر آباد، دیودھر، خضری، پیرووالہ، شاہپور اور لیڈا میں بھی مکتب تھے، جہاں ابتدائی فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔[۳]

سنگھور:

اسی حلقے کے بابائین اور ماجری حلقے میں دو مکتب تھے۔ یہاں قاضی رحیم بخش اور محمد یٰسین طلباً کو فارسی پڑھاتے تھے اور انہیں بھی تنخواہ کے عوض میں سالانہ ۱۸ من اناج دیا جاتا تھا۔[۴]

شاہ آباد:

یہاں کے مشائخ نے ایک مکتب قائم کیا تھا، جہاں، عالم وفاضل مدرس میاں ایوب خان طالبین علم کو فارسی درس دیتے تھے۔[۵]

مولانا حلقے کے شملہ، راجوکھیڑی اور ساہا کے مدرسوں میں بھی فارسی پڑھائی جاتی تھی۔[۶]

نارائن گڈھ:

اس حلقے کے جٹوار گاؤں میں چودھری گوپی چندر کے گھرمین ایک مکتب تھا، سڈھورا کے سید عابد حسین طلباً کو فارسی پڑھاتے تھے اور پانچ روپے ماہانہ پاتے تھے۔[۷]

---

۱ ہسٹری آف انڈیجینس ایجوکیشن اِن دی پنجاب؛ ۲۸:۲
۲ ایضاً ۲۸:۲
۳ ایضاً ۲۹:۲
۴ ایضاً ۳۰:۲
۵ ایضاً ۳۰:۲
۶ ایضاً ۳۱:۲
۷ ایضاً ۳۱:۲

اسی حلقے کے بھوراوالا گاؤں میں ایک مکتب تھا، جہاں علی احمد شیخ فارسی کا درس دیتے تھے[1]۔

تھانیسر:

تھانیسر میں درگاہ شیخ چلی کے قریب ایک مدرسہ تھا، اسی لئے یہ مدرسہ شیخ چلی کے نام سے مشہور تھا، اس کی چاروں دیواروں میں نو نو دروازے ہیں اور جانب مشرق کا دروازہ مع سیڑھیوں کے بنا ہوا ہے۔ اس کے دروازے ہندی وضع کے ہیں، اب یہ عمارت شکستہ حال اور مرمت طلب ہے، محکمۂ آثار قدیمہ ہند کے بیان سے منکشف ہوتا ہے کہ اس مدرسہ کو ۱۰۷۱ھ/۱۶۶۱ء میں دارا شکوہ نے تعمیر کرایا تھا[2]۔

پانی پت:

پانی پت میں تقریباً ۲۰ قرآنی مکتب تھے جن میں دوسو طلباً پڑھتے تھے۔ ان مین سے چھ مدرسے لڑکیوں کے لیے تھے[3]۔

رنبا:

یہاں دو مدرسے تھے۔ ایک میر درد کی مسجد میں واقع تھا اور احمد حسین (عرف مسیتا) اس کا ناظم تھا۔ اس مدرسے میں ۲۸ طلباً، قرآن کے علاوہ گلستان، بوستان اور بہار دانش پڑھتے تھے۔ اساتذہ کو روزانہ کھانے کے علاوہ فصل کٹنے پر ۵۰ من اناج اور گانوں میں کسی کے یہاں شادی کے موقع پر ایک روپیہ نقد بھی ملتا تھا۔

دوسرا مکتب متھرا مہاجن کے گھر میں تھا، یہاں غریب بن ہردواری آٹھ طالب علموں کو فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب اور گلستان اور بوستان پڑھاتے تھے۔ ہر ایک طالب علم مدرس کو چار آنہ مہینہ اور ہفتے میں ایک بار کھانا مہیا کرتا تھا[4]۔

کورانہ- یہاں ضلع دار کے گھر سے متصل مکتب میں امان اللہ مدرس تین طلباً کو فارسی (گلستاں اور بہار

---

۱ ہسٹری آف انڈیجینس ایجوکیشن اِن دی پنجاب: ۳۱:۲

۲ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں: ۳۰

۳ ہسٹری آف انڈیجینس ایجوکیشن ان دی پنجاب؛ ۱۴:۲

۴ ایضاً: ۱۴:۲

دانش) پڑھاتے تھے اور سات روپے ماہانہ پاتے تھے[1]۔

حصار:

یہاں تین مدرسے تھے جو بالترتیب رحمت اللہ، عزیز الدین اور غلام رسول کی زیر نگرانی تھے۔ ۲۳ طلبأ کو فارسی پڑھاتے تھے۔ پہلے دو اساتذہ کو دس دس روپے ماہوار ملتے تھے اور آخر الذکر کچھ نہیں لیتے تھے مگر تیوہار کے موقع پر عیدی ضرور لیتے تھے[2]۔

فتح آباد- ہنس پور گانوں کی مسجد میں ایک مکتب تھا، اس میں مولوی خدا بخش ۳۵ طلبأ کو عربی، فارسی اور قرآن پڑھاتے تھے[3]۔

ہانسی - ہانسی میں ایک مہاجن کے گھر میں ایک مکتب تھا جس میں قادر بخش ۲۰ طلبأ کو فارسی کا درس دیتے تھے اور پانچ روپے ماہانہ پاتے تھے[4]۔

ٹوہانہ- یہاں کی مسجد میں ایک مدرسہ تھا جس مین عبداللہ فارسی پڑھاتے تھے[5]۔

ان کے علاوہ اس علاقے میں مندرجہ ذیل جگھوں میں بھی مکاتب تھے۔ مکاتب اور طلبأ کی تعداد اس طرح تھی[6]

جگہ کا نام	تعداد مکتب	تعداد طلبأ
چندن کلاں	۲	۴۲
الیکا	۲	۶
بھٹو	۱	۴
سردارہ والہ	۱	۵
ماوڑ کلاں	۱	۷
نانگل	۱	۷

---

۱ ہسٹری آف انڈیجینس ایجوکیشن ان دی پنجاب: ۲: ۱۵

۲ ایضاً ۲: ۱۷

۳ ایضاً ۲: ۱۷

۴ ایضاً ۲: ۱۸

۵ ایضاً ۲: ۱۸

۶ ایضاً ۲: ۱۹

بڈھاکھیڑا ۱ ۴

بستی بھیما ۱ ۵

بلیالوالہ ۱ ۱۰

ہارولی ۱ ۸

الاولوس ۱ ۱۷

ناگپور ۱ ۸

کرنال:

مولوی غلام محمد اور انکے معاون صلاح الدین، قلندر دروازے پر ایک مدرسہ چلاتے تھے، جہاں ۲۵ طلباً کو فارسی پڑھاتے تھے، مولوی غلام محمد کو پندرہ روپے اور صلاح الدین کو چھ روپے ماہانا ملتا تھا[1]۔

الو پور۔ ضلعدار کے گھر میں مدرسہ تھا۔ یہاں امان اللہ ۳ طلباً کو فارسی (گلستان، بہاردانش) پڑھاتے تھے اور سات روپے ماہانہ ملتا تھا[2]۔

گوہلہ۔ سید شاہ محمد ۲۰ طلباً کو فارسی پڑھاتے تھے، ان کی اس خدمات کے عوض میں گانوں کے نمبردار محمد بخش سے انہیں چار روپے ماہانہ ملتا تھا[3]۔

کیتھل۔ یہاں سید برکت علی نے اپنے گھر میں ایک مکتب کھول رکھا تھا، جس میں وہ ۱۵ طلباً کو فارسی اور قرآن پڑھاتے تھے۔ انہیں تین روپے مشاہرہ ملتا تھا[4]۔

دھرت۔ یہاں علی بندہ کے مکتب میں ۱۲ طلباً فارسی پڑھتے تھے[5]۔

نارنول۔ نارنول مدرسوں کا شہر تھا[6]۔ شیرشاہ سوری (۱۵۴۰-۱۵۴۵ء) نے نارنول میں ایک بہت بڑی عمارت میں مدرسہ قائم کیا تھا۔ یہ مدرسہ ایک لاکھ روپے کی لاگت سے تیار ہوا تھا۔ اس پر لگے ہوئے ایک

۱۔ ہسٹری آف انڈ یجینس ایجوکیشن ان دی پنجاب؛ ۱۵:۲

۲۔ ایضاً ۱۵:۲

۳۔ ایضاً ۱۶:۲

۴۔ ایضاً ۱۶:۲

۵۔ ایضاً ۱۶:۲

۶۔ تذکرہ صوفیائے میوات: ۸۸

کتبے کے مطابق یہ مدرسہ ۹۲۷ھ (۱۵۲۰ء) میں تعمیر ہوا۔ یہ مدرسہ شیر شاہ سوری نے اپنے دادا ابراہیم سوری کی یاد مین اپنے عہد حکومت (۱۵۴۰ء-۱۵۴۵ء) سے بیس سال پہلے بنوایا تھا۔ ابراہیم سوری کی قبر بھی یہیں ہے[1]۔

اس کے علاوہ نارنول میں ایک اور مدرسہ تھا جسے شیخ محمد ترک نارنولی، قاضی شمس الدین شیبانی اور احمد مجد شیبانی وغیرہ نے قائم کیا تھا[2]۔

خواجہ نظام الدین نارنولی کا مدرسہ، اکبری دور کے بہت مشہور مدارس میں ایک تھا، اپنی تعلیمی خدمات اور تربیتی فیوض کے باعث اس کی خاص اہمیت ہے[3]۔

روہتک - یہاں ایک کرائے کے مکان مین ایک مکتب تھا، جہاں یوسف خان فارسی پڑھایا کرتے تھے اور سات روپے مشاہرہ ملتا تھا[4]۔

جھجر - شیخ محمد حسن کا مکتب یہاں بہت مشہور مکتب تھا۔ وہ پانچ روپے ماہوار پاتے تھے۔ عید کے دن انہیں ایک آنہ فی طالب علم مزید ملتا تھا[5]۔

کھیڑی - رسالدار میجر تھاور خان کے گھر میں مکتب تھا، حمایت علی یہاں فارسی پڑھایا کرتے تھے، ان کا ماہانا سات روپے تھا[6]۔

گوہانہ - چودھری غلام محی الدین خان کے گھر میں ایک مکتب تھا، جو غلام محمد کی زیر نگرانی تھا، یہ یہاں فارسی پڑھاتے تھے، ان کا ماہانہ سات روپے تھا[7]۔

حسن گڈھ - یہاں مسجد سے متصل ایک بہت بڑا مکتب تھا، نجیب اللہ ۲۲ طلباً کو فارسی پڑھاتے تھے[8]۔

۱؎ پروموشن آف لرننگ ان انڈیا ڈیورنگ محمڈن رول: ۱۳۷
ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں: ۳۰

۲؎ تذکرہ صوفیائے میوات: ۸۸

۳؎ ایضاً: ۹۶

۴؎ ہسٹری آف انڈیجینس ایجوکیشن ان دی پنجاب: ۲:۲۱

۵؎ ایضاً: ۲:۲۰

۶؎ ایضاً: ۲:۲۱

۷؎ ایضاً: ۲:۲۱

۸؎ ایضاً: ۲:۲۲

گوڑگاؤں:

گوڑگاؤں - گوڑگاؤں چھاونی مین ایک مکتب تھا، یہ مکتب کسی کے گھر میں تھا۔ اس مین فیض علی ۱۳ اطلبأ کو فارسی پڑھاتے تھے، چھ روپے ماہانہ اور خوراک پاتے تھے۔ اس کے علاوہ دو اور چھوٹے مکتب بھی یہاں تھے۔ ان مین سے ایک میں پانچ اور دوسرے میں سات طلبأ فارسی پڑھتے تھے[1]۔

پلہ - شیخ محمد موسیٰ نے موضع پلہ میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا، ابتدائی دنوں میں پلہ کی مسجد میں درس دیا۔ جب خانقاہ بن کر تیار ہوگئی تو مدرسہ کو بھی خانقاہ سے ملحق کردیا گیا۔ یہاں اسلامی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی[2]۔ (موضع پلہ اب ضلع فرید آباد میں ہے)

سہنہ - سہنہ میوات (ہریانہ ہی کا یک علاقہ) کا قدیم اور تاریخی قصبہ ہے۔ کسی زمانے میں یہ اچھا خاصا ثقافتی اور تہذیبی مرکز رہا ہے۔ یہان شاہ ولایت" کی مسجد، خانقاہ اور تکیہ ہے جس کا طرز تعمیر تغلق کا ہے۔ یہاں ایک دوسری مسجد بھی ہے جو بارہ کھمبا کہلاتی ہے۔ اس کا سنہ تعمیر ۱۳۸۱ء ہے۔ ''مسجد شاہ نجم الحق'' ۱۴۸۱ء میں تعمیر ہوئی، اس کے چاروں طرف بڑی نفیس بارہ دری بنی ہوئی تھی، جس میں کسی زمانے میں مدرسہ بھی تھا اور خانقاہ بھی۔ اس مدرسے کی نگرانی حضرت شاہ نجم الحق ہی کے ذمے تھی اس مدرسے کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء) کی تربیت گاہ رہا ہے[3]۔

پلول - دلی رآگرہ روڈ پر واقع پلول، بہت پرانا قصبہ ہے۔ مہابھارت میں جس اپیلو کا ذکر ہے، وہ یہی پلول ہے۔ اگرچہ یہان پر متعدد مسجدیں ملتی ہیں، مگر بظاہر یہاں مدرسے کے نام سے کوئی جگہ مخصوص نہیں رہی، لیکن یہ ممکن نہیں کہ یہاں کوئی مدرسہ نہ رہا ہو۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خاندان کی ایک شاخ، تقسیم ملک (۱۹۴۷ء) تک یہان موجود تھی۔ یہ علم دوست خاندان تھا، یہاں ضرور ان کا مدرسہ رہا ہوگا[4]۔

فیروز پور کا جھرکا - فیروز شاہ تغلق نے ۷۵۷ھ (۱۳۵۶ء) میں یہ قصبہ بسایا تھا۔ یہ قصبہ

---

1. ہسٹری آف انڈیجینس ایجوکیشن اِن دی پنجاب: ۱۳:۲
2. تذکرہ صوفیائے میوات: ۹۱
3. تذکرہ صوفیاے میوات: ۹۴
4. ایضاً: ۱۰۶

حصار فیروزہ کے نام سے بھی مشہور ہے، یہ شیر شاہ سوری (۱۵۴۰ء-۱۵۴۵ء) کے عہد مین خواص خاں کا دارالخلافہ تھا۔ یہیں پر سلیم شاہ سوری کی فوجوں کو شکست ہوئی تھی۔

یہاں اسلامی مدارس اور مکاتب کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔ چنانچہ ایک حافظ صاحب (نام نہیں معلوم ہوسکا) یہیں قرآن کریم کی تعلیم دیتے تھے۔ فارسی کی تعلیم بھی عام تھی، حافظ صاحب کا ۱۰۰۷ھ (۱۵۹۸ء) میں وصال ہوا۔ عبدالقوی نام کے ایک اور معلم تھے۔ ان کا وصال ۱۱۲۰ (۱۷۰۸ء) میں ہوا[1]۔

نگینہ- مولوی حفیظ الدین مداپوری نے ۱۳۶۷ھ (۱۹۴۷ء)، میں یہاں مدرسے کی بنیاد رکھی۔ اس مدرسے کا نام ''مدرسہ اسلامیہ دارالعلوم'' تھا[2]۔

ہتھین- مدرسہ دارالعلوم عبدیہ ہتھین کے بانی مولانا عبداللہ مالپوری تھے[3]۔

نوح- قصبہ نوح میوات کے اہم قصبات مین شار ہوتا ہے۔ یہاں پر ایک اسلامی مدرسہ ہے۔ حضرت مولانا محمد الیاس (بانی تبلیغی جماعت) کی کوششوں اور ترغیب پر مدرسہ معین الاسلام کی ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء میں بنیاد رکھی گئی[4]۔

---

۱ تذکرہ صوفیائے میوات: ۱۰۸

۲ ایضاً: ۱۲۱

۳ ایضاً: ۱۲۱

۴ ایضاً: ۱۱۸

باب چہارم

علمأ

شیخ ابو الفتح تھانیسری

ان کا شمار اپنے زمانے کے نامور علمأ میں ہوتا تھا۔ ان کے والد کا نام عبدالغفور تھانیسری تھا، یہ مولانا حسن شیرازی کے خلفأ میں سے تھے۔ حدیث کی سند ان کو رفیع الدین محدث سے ملی تھی۔ پچاس سال تک اکبر آباد میں محلہ میر فشاراللہ میں علوم عقلی و نقلی کے درس اور تدریس میں مشغول رہے۔ اس زمانے کے بہت سے علمأ نے ان کے دامن کے زیر سایہ تربیت پائی تھی۔ مشہور تصنیف ''منتخب التواریخ'' کے مصنف مولوی عبدالقادر بدایونی اور کمال الدین حسین بھی ان کے تلامذہ میں سے تھے۔

شیخ ابو الفتح تھانیسری کے والد محترم شیخ عینی[1] اکبر آباد میں افتا کے عہدے پر مامور تھے۔ ۹۷۶ھ/۱۵۶۸ء میں وفات پائی۔

احمد بن محمد ہانسوی

شیخ برہان الدین، احمد محمد ہانسوی کے بیٹے اور شیخ جمال الدین نعمانی کے بھانجے تھے۔ احمد بن محمود ۶۵۴ھ (۱۲۵۶ء) میں ہانسی میں پیدا ہوئے۔ دلی میں اساتذہ وقت سے فقہ اور اصول اور عربی کی تعلیم پائی۔ یہیں حضرت شیخ نظام الدین اولیا سے بیعت ہوئے اور ان کی وفات کے بعد دلی میں مقیم رہے۔ اس کے بعد دولت آباد منتقل ہو گئے۔ ان سے بہت لوگوں نے فیض حاصل کیا۔ ان کے

[1] طبقات شاہجہانی کے علی گڑھ اور لندن کے نسخے میں عیسیٰ ہے۔

مرید رکن الدین نے ان کے ملفوظات ''نفائس الانفاس'' کے نام سے اوران کے بھائی حماد ابن عماد نے ''احسن الاقوال'' کے نام سے جمع کئے۔ ان کے ملفوظاب کے دو اور مجموعے ''غیب الکرامات'' اور ''بقیۃ الغرایب'' بھی ملتے ہیں۔

۱۱رصفر ۷۳۸ھ (۸ستمبر، ۱۳۳۷ء) کو دولت آباد میں رحلت کی۔

شیخ امان اللہ پانی پتی

ان کا اصلی نام عبد الملک اور لقب ''امان اللہ'' اور ''غالب'' تھا۔ لیکن اول الذکر لقب ہی لوگوں میں زبان زد تھا۔ شیخ فرید گنج شکر کے اشارے پر شیخ محمد حسین بن طاہر جونپوری کے مرید ہو گئے، اگرچہ ارادت اور خلافت انہیں شیخ محمد حسین قادری سے تھی۔ علم تصوف میں مودود لاری کے شاگرد تھے۔

اپنے زمانے کے اکثر سلاسل سے ان کا تعلق تھا۔ سلسلہ، قادریہ میں ان کا سلسلہ شاہ محدث نعمت اللہ ولی تک پہنچتا ہے۔ ان کا صوفیا اور شیخ محی الدین عربی قدس سرہ کے سلسلے میں بلند مرتبہ تھا۔

شیخ امان اللہ تصوف اور توحید کے مسائل پر بڑی فصیح تقریر کرتے تھے۔ انہی مسائل پر ان کی کتابیں اور رسالے بھی موجود ہیں۔ ان میں شرح لوائح حضرت مولانا عبد الرحمٰن جامیؒ معروف ہے، جو اس طائفہ کے علم کی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ ان کی ایک اور مشہور تصنیف ''اثبات الاحدیہ'' ہے۔

ان کا مقولہ تھا کہ اگر دنیا کے لوگ روش انصاف کے اصول پر عمل کریں، تو وحدت الوجود کا مسئلہ عقلی اور نقلی دلائل سے خاطر نشان ہو سکتا ہے۔ وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے پاس درویشی کے دو ہی سرمائے ہیں۔ ایک تہذیبِ اخلاق اور دوسرا حضرت رسول ﷺ کے خاندان کی محبت۔ مجلس میں نہ کبھی دنیا کا ذکر کرتے، نہ کبھی بے معنی بات کہتے اور نہ ہی کسی کی عیب جوئی کرتے۔ ان کا بیشتر وقت نشرِ علوم میں صرف ہوتا تھا۔ کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ہمیشہ انہی کے مطالعے میں مصروف رہتے تھے۔ غرضیکہ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم و فاضل تھے۔ ہمہ وقت تہذیب اخلاق کے فروغ میں لگے رہتے تھے۔

انکے شاگردوں کی بڑی تعداد تھی۔ گاہ بگاہ دلی تشریف لاتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ وقت رخصت دوستوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ اب ایک لمبے سفر کا وقت آ گیا ہے۔ احباب نے عرض کیا

کہ وہ بھی ان کے ساتھ جانا چاہتے ہیں۔ اس پر فرمایا، اگر سفر ظاہری طور پر ہوگا تو یار دوستوں ہی کے ساتھ ہوگا، ورنہ آپ سب کو یار دوستوں کے سپرد کرنا چاہوں گا۔

ان کی تاریخ وفات کے بارے میں کافی اختلافات ہیں۔ سیر المتاخرین (۱:۲۸) کے مطابق ۱۲ ربیع الآخر ۹۵۸ھ (۱۹ اپریل، ۱۵۵۱ء) کو وفات پائی، جب کہ گلزار ابرار (۲۶۶) اور اخبار الاخیار (۲۴۷) اور علمائے ہند (۱۲۰) کے مطابق ۹۵۷/۱۵۵۰ء میں وفات پائی۔ ان کی دائمی خوابگاہ پانی پت میں ہے۔

ایواد حصاری

''زبدۃ العلوم'' ایواد حصاری کی تصنیف ہے جو حضرت محمد اور ان کے صحابہ، اس زمانے کے معروف دانشمندان اور اصفیا کے اساطیر اور سنت کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ عبدالقادر گیلانی کی کرامات اور جنت اور دوزخ کا بھی تفصیل سے ذکر ہے۔

بالکرشن برہمن حصاری

''دمشق خیال'' تصوف سے متعلق ایک مفصل کتاب ہے جسے بالکرشن برہمن حصاری نے ۱۰۸۵ھ (۱۶۷۴-۱۶۷۵ء) میں تصنیف کیا تھا۔ اس عنوان کے انتخاب کی وجہ، خود مصنف کے مطابق، یہ تھی کہ اس تصنیف کا روحانی پہلو سیریا کے شہر دمشق کی آب و ہوا کے مانند مسرت بخش ہے، زبان میں روانی اور فصاحت ہے اور موضوعات میں تنوع ہے۔ اگر چہ کتاب منثور ہے مگر حسب ضرورت حکایات اور اشعار کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر اشعار ان کے اپنے ہی ہیں اور کچھ اشعار اپنے وقت کے مشہور و معروف اصفیا جیسے شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی (۴۷۱-۵۶۱ھ)، ابراہیم آدم، شیخ بایزید بسطامی (متوفی ۲۶۱) کے بھی لیے ہیں، صوفی پیر اور ''مخازن القادریہ'' کے مصنف شمس الدین ان کے پیر مرشد تھے۔

انڈیا آفس لائبریری میں جو اس کا نسخہ موجود ہے۔ وہ مصنف کا پہلا مسودہ ہے۔ جے. ایم. پیلے نے یہ نسخہ ھدیہ کے طور پر لائبریری کو دیا تھا۔

بکانا گاؤں کے نمبر دار فتح علی کے گھر میں ایک مکتب قائم تھا، اس میں صرف پانچ طلبا تھے جو فارسی (گلستان وغیرہ) پڑھتے تھے۔ فتح علی مدرس کو نقد تنخواہ کی جگہ سال میں دو مرتبہ ۱۲ من دھان دیتے تھے[1]۔

گمتھلا گاؤں کی مسجد میں بھی ایک مکتب تھا، جس میں ۱۲ طلباء فارسی پڑھتے تھے[2]۔

یمنا نگر:

جگادھری کے مکتب میں مولوی عبد القادر فارسی پڑھاتے تھے۔ اس کے علاوہ خضر آباد، دیودھر، خضری، پیرووالہ، شاہپور اور لیڈا میں بھی مکتب تھے، جہاں ابتدائی فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی[3]۔

سنگھور:

اسی حلقے کے بائین اور ماجری حلقے میں دو مکتب تھے۔ یہاں قاضی رحیم بخش اور محمد یٰسین طلباً کو فارسی پڑھاتے تھے اور انہیں بھی تنخواہ کے عوض میں سالانہ ۱۸ من اناج دیا جاتا تھا[4]۔

شاہ آباد:

یہاں کے مشائخ نے ایک مکتب قائم کیا تھا، جہاں، عالم وفاضل مدرس میاں ایوب خان طالبین علم کو فارسی درس دیتے تھے[5]۔

مولانا حلقے کے شملہ، راجوکھیڑی اور ساہا کے مدرسوں میں بھی فارسی پڑھائی جاتی تھی[6]۔

نارائن گڈھ:

اس حلقے کے جٹوار گاؤں میں چودھری گوپی چندر کے گھر مین ایک مکتب تھا، سڈھورا کے سید عابد حسین طلباً کو فارسی پڑھاتے تھے اور پانچ روپے ماہانہ پاتے تھے[7]۔

۱۔ ہسٹری آف انڈیجینس ایجوکیشن اِن دی پنجاب؛ ۲۸:۲

۲۔ ایضاً ۲۸:۲

۳۔ ایضاً ۲۹:۲

۴۔ ایضاً ۳۰:۲

۵۔ ایضاً ۳۰:۲

۶۔ ایضاً ۳۱:۲

۷۔ ایضاً ۳۱:۲

اسی حلقے کے بھوراوالا گاؤں میں ایک مکتب تھا، جہاں علی احمد شیخ فارسی کا درس دیتے تھے[1]۔

تھانیسر:

تھانیسر میں درسگاہ شیخ چلی کے قریب ایک مدرسہ تھا، اسی لئے یہ مدرسہ شیخ چلی کے نام سے مشہور تھا، اس کی چاروں دیواروں میں نونو دروازے ہیں اور جانب مشرق کا دروازہ مع سیڑھیوں کے بناہوا ہے۔ اس کے دروازے ہندی وضع کے ہیں، اب یہ عمارت شکستہ حال اور مرمت طلب ہے، محکمۂ آثار قدیمہ ہند کے بیان سے منکشف ہوتا ہے کہ اس مدرسہ کو ۱۰۷۱ھ/۱۶۶۱ء میں دارا شکوہ نے تعمیر کرایا تھا[2]۔

پانی پت:

پانی پت میں تقریباً ۲۰ قرآنی مکتب تھے جن میں دوسو طلباً پڑھتے تھے۔ ان میں سے چھ مدرسے لڑکیوں کے لیے تھے[3]۔

رنبا:

یہاں دو مدرسے تھے۔ ایک میر درد کی مسجد میں واقع تھا اور احمد حسین (عرف مسیتا) اس کا ناظم تھا۔ اس مدرسے میں ۲۸ طلباً، قرآن کے علاوہ گلستان، بوستان اور بہار دانش پڑھتے تھے۔

اساتذہ کو روزانہ کھانے کے علاوہ فصل کٹنے پر ۵۰ من اناج اور گانوں میں کسی کے یہاں شادی کے موقع پر ایک روپیہ نقد بھی ملتا تھا۔

دوسرا مکتب متھرا مہاجن کے گھر میں تھا، یہاں غریب بن ہردواری آٹھ طالب علموں کو فارسی کی پہلی اور دوسری کتاب اور گلستان اور بوستان پڑھاتے تھے۔ ہر ایک طالبِ علم مدرس کو چار آنہ مہینہ اور ہفتے میں ایک بار کھانا مہیا کرتا تھا[4]۔

کورانہ- یہاں ضلع دار کے گھر سے متصل مکتب میں امان اللہ مدرس تین طلباً کو فارسی (گلستاں اور بہار

۱۔ ہسٹری آف انڈیجینس ایجوکیشن اِن دی پنجاب: ۲: ۳۱

۲۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں: ۳۰

۳۔ ہسٹری آف انڈیجینس ایجوکیشن ان دی پنجاب؛ ۲: ۱۴

۴۔ ایضاً: ۲: ۱۴

دانش) پڑھاتے تھے اور سات روپے ماہانہ پاتے تھے[1]۔

حصار:

یہاں تین مدرسے تھے جو بالترتیب رحمت اللہ، عزیز الدین اور غلام رسول کی زیر نگرانی تھے۔ یہ ۳۲ طلباً کو فارسی پڑھاتے تھے۔ پہلے دو اساتذہ کو دس دس روپے ماہوار ملتے تھے اور آخر الذکر کچھ نہیں لیتے تھے مگر تیوہار کے موقع پر عیدی ضرور لیتے تھے[2]۔

فتح آباد۔ ہنس پور گانوں کی مسجد میں ایک مکتب تھا، اس میں مولوی خدا بخش ۳۵ طلباً کو عربی، فارسی اور قرآن پڑھاتے تھے[3]۔

ہانسی - ہانسی میں ایک مہاجن کے گھر میں ایک مکتب تھا جس میں قادر بخش ۲۰ طلباً کو فارسی کا درس دیتے تھے اور پانچ روپے ماہانہ پاتے تھے[4]۔

ٹوہانہ- یہاں کی مسجد میں ایک مدرسہ تھا جس مین عبداللہ فارسی پڑھاتے تھے[5]۔

ان کے علاوہ اس علاقے میں مندرجہ ذیل جگہوں میں بھی مکاتب تھے۔ مکاتب اور طلباً کی تعداد اس طرح تھی[6]

جگہ کا نام	تعداد مکتب	تعداد طلباً
چندن کلاں	۲	۴۲
الیکا	۲	۶
بھٹو	۱	۴
سردارہ والہ	۱	۵
ماوڑ کلاں	۱	۷
نانگل	۱	۷

---

[1] ہسٹری آف انڈیجینس ایجوکیشن ان دی پنجاب : ۲: ۱۵

[2] ایضاً ۲: ۱۷

[3] ایضاً ۲: ۱۷

[4] ایضاً ۲: ۱۸

[5] ایضاً ۲: ۱۸

[6] ایضاً ۲: ۱۹

بڈھا کھیڑا	۱	۴
بستی بھیما	۱	۵
بلیالوالہ	۱	۱۰
ہارولی	۱	۸
الاولوس	۱	۱۷
ناگپور	۱	۸

کرنال:

مولوی غلام محمد اور انکے معاون صلاح الدین، قلندر دروازے پر ایک مدرسہ چلاتے تھے، جہاں ۲۵ طلباً کو فارسی پڑھاتے تھے، مولوی غلام محمد کو پندرہ روپے اور صلاح الدین کو چھ روپے ماہانا ملتا تھا[۱]۔

الو پور- ضلعدار کے گھر میں مدرسہ تھا۔ یہاں امان اللہ ۳ طلباً کو فارسی (گلستان، بہاردانش) پڑھاتے تھے اور سات روپے ماہانہ ملتا تھا[۲]۔

گوہلہ- سید شاہ محمد ۲۰ طلباً کو فارسی پڑھاتے تھے، ان کی اس خدمات کے عوض میں گانوں کے نمبردار محمد بخش سے انہیں چار روپے ماہانہ ملتا تھا[۳]۔

کیتھل- یہاں سید برکت علی نے اپنے گھر میں ایک مکتب کھول رکھا تھا، جس میں وہ ۱۵ طلباً کو فارسی اور قرآن پڑھاتے تھے۔ انہیں تین روپے مشاہرہ ملتا تھا[۴]۔

دھرت- یہاں علی بندہ کے مکتب میں ۱۲ طلباً فارسی پڑھتے تھے[۵]۔

نارنول- نارنول مدرسوں کا شہر تھا[۶]۔ شیر شاہ سوری (۱۵۴۰-۱۵۴۵ء) نے نارنول میں ایک بہت بڑی عمارت میں مدرسہ قائم کیا تھا۔ یہ مدرسہ ایک لاکھ روپے کی لاگت سے تیار ہوا تھا۔ اس پر لگے ہوئے ایک

۱۔ ہسٹری آف انڈیجینس ایجوکیشن ان دی پنجاب: ۱۵:۲
۲۔ ایضاً ۱۵:۲
۳۔ ایضاً ۱۶:۲
۴۔ ایضاً ۱۶:۲
۵۔ ایضاً ۱۶:۲
۶۔ تذکرہ صوفیائے میوات: ۸۸

کتبے کے مطابق یہ مدرسہ ۹۲۷ھ (۱۵۲۰ء) میں تعمیر ہوا۔ یہ مدرسہ شیر شاہ سوری نے اپنے دادا ابراہیم سوری کی یاد میں اپنے عہد حکومت (۱۵۴۰ء-۱۵۴۵ء) سے بیس سال پہلے بنوایا تھا۔ ابراہیم سوری کی قبر بھی یہیں ہے[1]۔

اس کے علاوہ نارنول میں ایک اور مدرسہ تھا جسے شیخ محمد ترک نارنولی، قاضی شمس الدین شیبانی اور احمد مجد شیبانی وغیرہ نے قائم کیا تھا[2]۔

خواجہ نظام الدین نارنولی کا مدرسہ، اکبری دور کے بہت مشہور مدارس میں ایک تھا، اپنی تعلیمی خدمات اور تربیتی فیوض کے باعث اس کی خاص اہمیت ہے[3]۔

روہتک - یہاں ایک کرائے کے مکان مین ایک مکتب تھا، جہاں یوسف خان فارسی پڑھایا کرتے تھے اور سات روپے مشاہرہ ملتا تھا[4]۔

جھجر - شیخ محمد حسن کا مکتب یہاں بہت مشہور مکتب تھا۔ وہ پانچ روپے ماہوار پاتے تھے۔ عید کے دن انہیں ایک آنہ فی طالب علم مزید ملتا تھا[5]۔

کھیڑی - رسالدار میجر تھاور خان کے گھر میں مکتب تھا، حمایت علی یہاں فارسی پڑھایا کرتے تھے، ان کا ماہانا سات روپے تھا[6]۔

گوہانہ - چودھری غلام محی الدین خان کے گھر میں ایک مکتب تھا، جو غلام محمد کی زیر نگرانی تھا، یہ یہاں فارسی پڑھاتے تھے، ان کا ماہانہ سات روپے تھا[7]۔

حسن گڈھ - یہاں مسجد سے متصل ایک بہت بڑا مکتب تھا، نجیب اللہ ۲۲ طلباً کو فارسی پڑھاتے تھے[8]۔

۱۔ پروموشن آف لرننگ ان انڈیا ڈیورنگ محمڈن رول: ۱۳۷
ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں: ۳۰
۲۔ تذکرہ صوفیائے میوات: ۸۸
۳۔ ایضاً: ۹۶
۴۔ ہسٹری آف انڈیجینس ایجوکیشن ان دی پنجاب: ۲:۲۱
۵۔ ایضاً: ۲:۲۰
۶۔ ایضاً: ۲:۲۱
۷۔ ایضاً: ۲:۲۱
۸۔ ایضاً: ۲:۲۲

گوڑگاؤں:

گوڑگاؤں - گوڑگاؤں چھاونی مین ایک مکتب تھا، یہ مکتب کسی کے گھر میں تھا۔ اس مین فیض علی ۱۳ طلباً کو فارسی پڑھاتے تھے، چھ روپے ماہانہ اور خوراک پاتے تھے۔ اس کے علاوہ دو اور چھوٹے مکتب بھی یہاں تھے۔ ان مین سے ایک مین پانچ اور دوسرے میں سات طلباً فارسی پڑھتے تھے[1]۔

پلہ - شیخ محمد موسیٰ نے موضع پلہ میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا، ابتدائی دنوں میں پلہ کی مسجد میں درس دیا۔ جب خانقاہ بن کر تیار ہوگئی تو مدرسہ کو بھی خانقاہ سے ملحق کردیا گیا۔ یہاں اسلامی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی[2]۔ (موضع پلہ اب ضلع فریدآباد میں ہے)

سہنہ - سہنہ میوات (ہریانہ ہی کا یک علاقہ) کا قدیم اور تاریخی قصبہ ہے۔ کسی زمانے میں یہ اچھا خاصا ثقافتی اور تہذیبی مرکز رہا ہے۔ یہاں شاہ ولایت" کی مسجد، خانقاہ اور تکیہ ہے جس کا طرز تعمیر تغلق کا ہے۔ یہاں ایک دوسری مسجد بھی ہے جو بارہ کھمبا کہلاتی ہے۔ اس کا سنہ تعمیر ۱۳۸۱ء ہے۔

''مسجد شاہ نجم الحق'' ۱۴۸۱ء میں تعمیر ہوئی، اس کے چاروں طرف بڑی نفیس بارہ دری بنی ہوئی تھی، جس میں کسی زمانے میں مدرسہ بھی تھا اور خانقاہ بھی۔ اس مدرسے کی نگرانی حضرت شاہ نجم الحق ہی کے ذمے تھی اس مدرسے کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء) کی تربیت گاہ رہا ہے[3]۔

پلول - دلی/آگرہ روڈ پر واقع پلول، بہت پرانا قصبہ ہے۔ مہابھارت میں جس اپیلو کا ذکر ہے، وہ یہی پلول ہے۔ اگرچہ یہاں پر متعدد مسجدیں ملتی ہیں، مگر بظاہر یہاں مدرسے کے نام سے کوئی جگہ مخصوص نہیں رہی، لیکن یہ ممکن نہیں کہ یہاں کوئی مدرسہ نہ رہا ہو۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خاندان کی ایک شاخ، تقسیم ملک (۱۹۴۷ء) تک یہاں موجود تھی۔ یہ علم دوست خاندان تھا، یہاں ضرور ان کا مدرسہ رہا ہوگا[4]۔

فیروز پور کا جھرکا - فیروز شاہ تغلق نے ۷۵۷ھ (۱۳۵۶ء) میں یہ قصبہ بسایا تھا۔ یہ قصبہ

---

[1] ہسٹری آف انڈیجینس ایجوکیشن اِن دی پنجاب: ۱۳:۲

[2] تذکرہ صوفیائے میوات: ۹۱

[3] تذکرہ صوفیائے میوات: ۹۴

[4] ایضاً: ۱۰۶

حصار فیروزہ کے نام سے بھی مشہور ہے، یہ شیر شاہ سوری (۱۵۴۰ء-۱۵۴۵ء) کے عہد مین خواص خاں کا دارالخلافہ تھا۔ یہیں پر سلیم شاہ سوری کی فوجوں کو شکست ہوئی تھی۔

یہاں اسلامی مدارس اور مکاتب کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔ چنانچہ ایک حافظ صاحب (نام نہیں معلوم ہو سکا) یہیں قرآن کریم کی تعلیم دیتے تھے۔ فارسی کی تعلیم بھی عام تھی، حافظ صاحب کا ۱۰۰۷ھ (۱۵۹۸ء) میں وصال ہوا۔ عبدالقوی نام کے ایک اور معلم تھے۔ ان کا وصال ۱۱۲۰(۱۷۰۸ء) میں ہوا[1]۔

نگینہ۔ مولوی حفیظ الدین مداپوری نے ۱۳۶۷ھ (۱۹۴۷ء)، میں یہاں مدرسے کی بنیاد رکھی۔ اس مدرسے کا نام ''مدرسہ اسلامیہ دارالعلوم'' تھا[2]۔

ہتھین۔ مدرسہ دارالعلوم عبدیہ ہتھین کے بانی مولانا عبداللہ ماپوری تھے[3]۔

نوح۔ قصبہ نوح میوات کے اہم قصبات مین شمار ہوتا ہے۔ یہاں پر ایک اسلامی مدرسہ ہے۔ حضرت مولانا محمد الیاس (بانی تبلیغی جماعت) کی کوششوں اور ترغیب پر مدرسہ معین الاسلام کی ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء میں بنیاد رکھی گئی[4]۔

---

[1] تذکرہ صوفیائے میوات: ۱۰۸

[2] ایضاً: ۱۲۱

[3] ایضاً: ۱۲۱

[4] ایضاً: ۱۱۸

باب چہارم

علمأ

شیخ ابو الفتح تھانیسری

ان کا شمار اپنے زمانے کے نامور علمأ میں ہوتا تھا۔ ان کے والد کا نام عبدالغفور تھانیسری تھا، یہ مولانا حسن شیرازی کے خلفأ میں سے تھے۔ حدیث کی سند ان کو رفیع الدین محدث سے ملی تھی۔ پچاس سال تک اکبرآباد میں محلہ میر فشاراللہ میں علوم عقلی و نقلی کے درس اور تدریس میں مشغول رہے۔ اس زمانے کے بہت سے علمأ نے ان کے دامن کے زیر سایہ تربیت پائی تھی۔ مشہور تصنیف ''منتخب التواریخ'' کے مصنف مولوی عبدالقادر بدایونی اور کمال الدین حسین بھی ان کے تلامذہ میں سے تھے۔

شیخ ابو الفتح تھانیسری کے والد محترم شیخ عینی[1] اکبر آباد میں افتا کے عہدے پر مامور تھے۔ ۹۷۶ھ/۱۵۶۸ء میں وفات پائی۔

احمد بن محمد ہانسوی

شیخ برہان الدین، احمد محمد ہانسوی کے بیٹے اور شیخ جمال الدین نعمانی کے بھانجے تھے۔ احمد بن محمود ۶۵۴ھ (۱۲۵۶ء) میں ہانسی میں پیدا ہوئے۔ دلی میں اساتذہ وقت سے فقہ اور اصول اور عربی کی تعلیم پائی۔ یہیں حضرت شیخ نظام الدین اولیا سے بیعت ہوئے اور ان کی وفات کے بعد دلی میں مقیم رہے۔ اس کے بعد دولت آباد منتقل ہو گئے۔ ان سے بہت لوگوں نے فیض حاصل کیا۔ ان کے

---

[1] طبقات شاہجہانی کے علی گڑھ اور لندن کے نسخے میں عیسیٰ ہے۔

مرید رکن الدین نے ان کے ملفوظات ''نفائس الانفاس'' کے نام سے اوران کے بھائی حماد ابن عماد نے ''احسن الاقوال'' کے نام سے جمع کیے۔ ان کے ملفوظاب کے دو اور مجموعے ''غیب الکرامات'' اور ''بقیۃ الغرایب'' بھی ملتے ہیں۔

۱۱رصفر ۷۳۸ھ (۸ستمبر، ۱۳۳۷ء) کو دولت آباد میں رحلت کی۔

شیخ امان اللہ پانی پتی

ان کا اصلی نام عبد الملک اور لقب ''امان اللہ'' اور ''غالب'' تھا۔ لیکن اول الذکر لقب ہی لوگوں میں زبان زد تھا۔ شیخ فرید گنج شکر کے اشارے پر شیخ محمد حسین بن طاہر جونپوری کے مرید ہوگئے، اگرچہ ارادت اور خلافت انہیں شیخ محمد حسین قادری سے تھی۔ علم تصوف میں مودود لاری کے شاگرد تھے۔

اپنے زمانے کے اکثر سلاسل سے ان کا تعلق تھا۔ سلسلہ، قادریہ میں ان کا سلسلہ شاہ محدث نعمت اللہ ولی تک پہنچتا ہے۔ ان کا صوفیا اور شیخ محی الدین عربی قدس سرہ کے سلسلے میں بلند مرتبہ تھا۔

شیخ امان اللہ تصوف اور توحید کے مسائل پر بڑی فصیح تقریر کرتے تھے۔ انہی مسائل پر ان کی کتابیں اور رسالے بھی موجود ہیں۔ ان میں شرح لوائح حضرت مولانا عبد الرحمٰن جامیؒ معروف ہے، جو اس طائفہ کے علم کی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ ان کی ایک اور مشہور تصنیف ''اثبات الاحدیہ'' ہے۔

ان کا مقولہ تھا کہ اگر دنیا کے لوگ روش انصاف کے اصول پر عمل کریں، تو وحدت الوجود کا مسئلہ عقلی اور نقلی دلائل سے خاطر نشان ہو سکتا ہے۔ وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے پاس درویشی کے دو ہی سرمائے ہیں۔ ایک تہذیبِ اخلاق اور دوسرا حضرت رسول ﷺ کے خاندان کی محبت۔ مجلس میں نہ کبھی دنیا کا ذکر کرتے، نہ کبھی بے معنی بات کہتے اور نہ ہی کسی کی عیب جوئی کرتے۔ ان کا بیشتر وقت نشرِ علوم میں صرف ہوتا تھا۔ کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ہمیشہ انہی کے مطالعے میں مصروف رہتے تھے۔ غرضیکہ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم و فاضل تھے۔ ہمہ وقت تہذیب اخلاق کے فروغ میں لگے رہتے تھے۔

انکے شاگردوں کی بڑی تعداد تھی۔ گاہ بگاہ دلی تشریف لاتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ وقتِ رخصت دوستوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا - اب ایک لمبے سفر کا وقت آگیا ہے۔ احباب نے عرض کیا

کہ وہ بھی ان کے ساتھ جانا چاہتے ہیں ۔ اس پر فرمایا، اگر سفر ظاہری طور پر ہوگا تو یار دوستوں ہی کے ساتھ ہوگا، ورنہ آپ سب کو یار دوستوں کے سپرد کرنا چاہوں گا۔

ان کی تاریخ وفات کے بارے میں کافی اختلافات ہیں ۔ سیر المتاخرین (۱:۲۸) کے مطابق ۱۲ ربیع الآخر ۹۵۸ھ (۱۹ اپریل، ۱۵۵۱ء) کو وفات پائی، جب کہ گلزار ابرار (۲۶۶) اور اخبار الاخیار (۲۴۷) اور علمائے ہند (۱۲۰) کے مطابق ۹۵۷/۱۵۵۰ء میں وفات پائی ۔ ان کی دائمی خوابگاہ پانی پت میں ہے۔

ایواد حصاری

''زبدۃ العلوم'' ایواد حصاری کی تصنیف ہے جو حضرت محمد اور ان کے صحابہ، اس زمانے کے معروف دانشمندان اور اصفیا کے اساطیر اور سنت کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ عبدالقادر گیلانی کی کرامات اور جنت اور دوزخ کا بھی تفصیل سے ذکر ہے۔

بالکرشن برہمن حصاری

''دمشق خیال'' تصوف سے متعلق ایک مفصل کتاب ہے جسے بالکرشن برہمن حصاری نے ۱۰۸۵ھ (۱۶۷۴-۱۶۷۵ء) میں تصنیف کیا تھا۔ اس عنوان کے انتخاب کی وجہ، خود مصنف کے مطابق، یہ تھی کہ اس تصنیف کا روحانی پہلو سیریا کے شہر دمشق کی آب و ہوا کے مانند مسرت بخش ہے، زبان میں روانی اور فصاحت ہے اور موضوعات میں تنوع ہے ۔ اگر چہ کتاب منثور ہے مگر حسب ضرورت حکایات اور اشعار کا بھی استعمال کیا گیا ہے ۔ ان میں سے زیادہ تر اشعار ان کے اپنے ہی ہیں اور کچھ اشعار اپنے وقت کے مشہور و معروف اصفیا جیسے شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی (۴۷۱-۵۶۱ھ) ، ابراہیم آدم، شیخ بایزید بسطامی (متوفی ۲۶۱) کے بھی لیے ہیں، صوفی پیر اور ''مخازن القادریہ'' کے مصنف شمس الدین ان کے پیر مرشد تھے۔

انڈیا آفس لائبریری میں جو اس کا نسخہ موجود ہے ۔وہ مصنف کا پہلا مسودہ ہے ۔ جے. ایم. پیلے نے یہ نسخہ ھدیہ کے طور پر لائبریری کو دیا تھا۔

اس کے علاوہ بالکرشن برہمن حصاری کی ایک اور تصنیف "تحفۃ الحکایات" یا "ہفتگانہ" کے نام سے ہے۔ یہ فارسی کی کتاب ۷ کہانیوں پر مشتمل ہے اور اسی وجہ سے اس کو ہفتگانہ بھی کہا جاتا ہے۔

یہ کتاب قطب الدین محمد معزم شاہ عالم بہادر (۱۷۰۷-۱۲ء) کے عہد حکومت کے چھٹے سال میں ۷ فروری ۱۷۱۲ء کو شاہجہان آباد میں لکھی گئی۔

قلمی نسخے:

دمشق خیال۔ نمبر ۳۶۸۲

تحفۃ الحکایات یا ہفتگانہ۔ نمبر ۹۴۴

انڈیا آفس لائبریری۔ لندن۔

قاضی ثناء اللہ عثمانی - پانی پتی

یہ جلال الدین اکبر الاولیا پانی پتی (م: ۱۳۶۳ء) کی اولاد میں سے تھے۔ ۱۱۴۳ھ (۱۷۳۰ء) میں ولادت ہوئی۔ بہت ہی پرہیز گار اور متقی تھے۔ سات سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کرلیا تھا اور ۱۶ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے تھے۔ کسب تحصیل کے دوران درسی کتابوں کے علاوہ ۵۰ کتابوں کا مطالعہ کیا۔ سب سے پہلے محمد عابد سنامی سے بیعت ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد مرزا مظہر جان جاناں شہید کی خدمت میں کمالات حاصل کئے، جنھوں نے انہیں "علم الہدی" کے لقب سے نوازا۔ مولانا شاہ عبدالعزیز انہیں اپنے وقت کا بیہقی کہا کرتے تھے۔

ظاہری اور باطنی علوم پر بڑی گہری نظر تھی۔ ساری عمر علم کی ترقی اور ترویج اور مشکل مسائل کے حل کرنے میں گزاری۔ علم تفسیر وفقہ وکلام وتصوف میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف اعلی درجے کی تھیں، جن کی تعداد تیس سے بھی زیادہ تھی۔

تفسیر مظہری — یہ سات حصوں میں ضخیم کتاب ہے۔ اس کا اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

سیف المسلول — یہ مذہب شیعہ میں شمشیر برہنہ کے نام سے مشہور ہے۔ 'ارشاد الطالبین' رسالہ مالا بدمنہ، تذکرہ الموتی والقبور، تذکرۃ المعاد، حقوق الاسلام (یہ حقیقت الاسلام کے نام سے بھی مشہور ہے)۔ رسالہ حرمت متعہ، رسالہ شہاب ثاقب وغیرہ ان کی دوسری کتابیں اور رسالے ہیں۔

قاضی ثناء اللہ نے یکم رجب ۱۲۲۵ھ (۱۲ اگست ۱۸۱۰ء) کو وفات پائی۔

جلال حصاری

جلال حصاری، سید مظفر خان براہ ملقب بہ خان جہان کا منشی تھا۔ خان جہاں، شاہجہان کی تخت نشینی سے لے کر ۱۶۴۵-۴۶ء تک گوالیار کا صوبے دار تھا۔

جلال حصاری کی دو تصنیفوں[1] کا پتہ چلتا ہے۔ ایک تو ''گوالیر نامہ'' اور دوسری ''وقایع ججہار سنگ''۔

اولالذکر کتاب ۱۶۴۵-۴۶ء تک کی گوالیار کی تاریخ ہے۔ یہ کتاب سیام برہمن کی ہندی کتاب پر مبنی ہے۔

دوسری کتاب اور چھا کے راجہ ججہار سنگ بندیلا کے کارہای نمایاں اور خاص طور پر اس کے خلاف شاہجہاں کی مہم کے بارے مین ہے۔ ان کتابون کے نسخے برٹش میوزیم، لندن میں موجود ہیں۔

حضرت شیخ جلال تھانیسری

شیخ جلال عالمانہ کمالات اور درویشانہ مقامات کے جامع، دریائے توحید کے غواص اور کشتی تحقیق کے ناخدا تھے۔

ان کے والد کا نام محمد الفاروق تھانیسری تھا۔ پدری اور مادری سلسلۂ نسب خلیفۃ المسلمیں حضرت عمر فاروق سے ملتا ہے۔ وہ حضرت عبدالقدوس گنگوہی (م: ۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء) کے خاص مریدوں اور خلفاء میں سے تھے۔ سلسلۂ طریقت یہ ہے۔

''شیخ جلال تھانیسری، مرید حضرت عبدالقدوس گنگوہی، مرید حضرت شیخ محمد عارف، مرید حضرت احمد عبدالحق، مرید حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتی، مرید حضرت مخدوم علی صابر پیران کلیری، مرید حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر''

---

[1] بنارسی پرساد سکسینہ نے اپنی انگریزی کی کتاب ''دی شاہجہاں آف دلی'' میں شیخ جلال حصاری کا نام درج کیا ہے، جن کے نام سے فارسی کی تین کتابیں منسوب ہیں۔ (۱) عرض داشت، (۲) اکاؤنٹ آف بندیلاز، (۳) اکاؤنٹ آف جگت سنگ، ۸۰، ۸۱، ۹۶، ۹۷، ۱۰۱

روایت ہے کہ اوائل شباب میں انہوں نے ایک خوش الحان شخص کو ایک غزل گاتے ہوئے سنا تو بیہوش ہو گئے اور چھت سے نیچے گر پڑے۔ کافی دیر تڑپنے کے بعد ہوش میں آئے۔

یہ ہمیشہ محویت اور استغراق کے عالم میں رہتے تھے اور کیفیت ان پر کچھ اس قدر طاری رہتی تھی کہ نماز کے وقت ان کے مریدین ''اللہ ہو اللہ ہو کہہ کر انہیں ہوش مین لاتے۔ وجد اور سماع کا ذوق تھا سلسلہ ٔ چشتیہ کے مشائخ متاخرین میں ان کے ہمپایہ درویش کم ہی ہوئے ہیں۔ ان کا مستقل قیام تھانیسر ہی میں رہا۔ آخری عمر میں بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ اپنے آپ اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے کی طاقت بھی نہیں رہ گئی تھی۔ اس کے باوجود جب اذان ہوتی تو خود بخود اٹھ بیٹھتے، وضو کرتے اور نماز میں بیٹھ جاتے۔

بلخ میں قرآن شریف حفظ کیا، ہندوستان آ کر تحصیل علوم ظاہری میں مشغول ہوئے اور صرف ونحو، تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، وغیرہ میں مصروف رہتے تھے۔ کبھی کبھی فتویٰ بھی دیتے تھے۔

حضرت عبدالقدوس گنگوہی سے بیعت تھے، انہوں نے کلاہ چہارتر کی اتار کر ان کے سر پر رکھی اور مختلف افکار و اشغال میں تعلیم دینے کے بعد ان کو خرقہ خلافت سے بھی سرفراز فرمایا۔

مرزا حکیم (ولادت: ۱۵۵۳ء) کی بغاوت فرو کرنے کی غرض سے پنجاب جاتے ہوئے اکبر بادشاہ (۱۵۵۶ء-۱۶۰۵ء) تھانیسر میں رکا اور ان کی خانقاہ میں حاضر ہو کر گلہائے عقیدت پیش کئے، یہ ۲ محرم ۹۸۰ھ (۱۵ مئی ۱۵۷۲ء) کا واقعہ ہے۔ ابوالفضل اور فیضی بھی اکبر کے ہمراہ تھے۔

ایک دن شیخ جلال کے ایک مرید نے کہا کہ عہد ماضی میں شیخ نجم الدین کبریٰ (وفات۔ ۱۰ جمادی الاول ۶۱۸ھ/ ۲ جولائی ۱۲۲۱) ایسے باکمال بزرگ تھے کہ جس پر ایک نظر ڈال دیتے، اسے مقام ولادیت پر پہنچا دیتے تھے۔ آج اس مرتبے کا کوئی درویش نظر نہیں آتا۔ یہ سن کر شیخ جلال نے کہا کہ اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں۔ یہ سنتے ہی وہ مرید بیہوش ہو کر گر پڑا۔ جب وہ ہوش میں آیا تو ولایت کے اعلیٰ مقام تک پہنچا ہوا تھا، لیکن تھوڑی دیر زندہ رہ کر وہ جان بحق تسلیم ہو گیا۔

شیخ عبدالبصیر، شیخ جلال کے فرزند رشید اور سجادہ نشین تھے[1]۔ شیخ بہاء الدین احمد سرہندی ان کے مریدان کامل میں سے تھے۔ جو ارادتمندوں میں بھی بڑے بلند پایہ تھے۔ ان کے مشہور مریدوں اور خلفاً میں شیخ نظام الدین تھانیسری، شیخ عبدالشکور، ان کے بھائی اور نظام الدین کے والد، قاضی سلیم

---

[1] شیخ جلال تھانیسری کا ایک فرزند فوت کر گیا تھا، شیخ جلال نے اس کے بعد سماع میں شریک ہونا بند کر دیا تھا۔
اخبار الاخیار: ۲۹۱

کیرانوی، شیخ موسیٰ، شیخ عیسیٰ، شیخ سید فاضل ٹوہانوی، حضرت میر اور شیخ جلال الدین تھانیسری کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

ارشاد الطالبین ان کی یادگار تصنیف ہے۔ یہ صوفی نقطہ نظر سے اسلام کے مذہبی اور اخلاقی فلسفہ کے بارے میں ہے۔ ''رسالہ تفسیر'' ان کی ایک اور تصنیف ہے، اس کے علاوہ ان کے مکتوبات کو بھی شہرت دوام حاصل ہے۔

انہوں نے بروز جمعہ ۲۵ ذی الحجہ ۹۸۹ھ[1] (۲۰ جنوری ۱۵۸۲ء) کو ۹۶ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ان کا مزار تھانیسر میں موجود ہے۔ ''سر دفتر اولیا''[2] سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

شیخ جنید حصاری

شیخ فرید الدین گنج شکر کی اولاد میں سے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی کتابت کی رفتار اتنی تیز تھی کہ تین دن میں پورا قرآن مجید اعراب کے ساتھ لکھ دیتے تھے۔ انہوں نے اپنے کچھ رسالوں میں غرائب و نوادرِ عالمی کے بارے میں لکھا ہے، جو عوالم خداوندی سے ان پر ظاہر ہوئے۔ ان کے بیشتر نوشتے عام وہم و فہم سے بالا ہیں۔

تذکرے مشائخ کے مطابق شیخ جنید حصاری نے ۹۰۰ھ (۱۴۹۴ء) میں وفات پائی۔ ان کی قبر حصار میں ہے۔

شیخ حسن بن حسام نارنولی

عالم و فقیہ شیخ حسن بن حسام نارنولی رحمۃ اللہ علیہ، قاضی تاج الدین ہروی کی اولاد میں سے تھے۔ ان کی پیدائش اور پرورش نارنول میں ہوئی۔ درسی کتب اپنے والد محترم سے پڑھیں۔ طریقت و تصوف قاضی شمس الدین جدِ امجد قاضی احمد مجد شیبانی سے حاصل کئے۔ اپنے وطن ہی میں کامل ہوکر لاہور تشریف لے گئے اور وہاں چالیس سال درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ ۹۹۸ھ (۱۵۵۹ء) میں وفات پائی۔

---

[1] ۱۴ ذی الحجہ ۹۶۹ یا ۹۸۹ کو ۹۳ سال کی عمر میں وفات پائی۔ نزہۃ الخواطر ۴:۳۰۷

[2] اس کے حساب سے ۹۹۲ھ نکلتا ہے۔

عالم و فاضل تھے۔ ''دلائل الخیرات'' کی شرح ''تبسیر البرکات'' ان کی تالیف ہے، جس میں نسخ کے اختلاف کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

حضرت شاہ محمد رمضان مہمی

محمد رمضان، عبدالعظیم مجذوب بن شاہ عبدالحکیم مہمی بن شاہ لطف اللہ الملقب بہ عطا محمد خان سہ ہزاری اور نائب صوبے دار لاہور کے فرزندِ اکبر تھے۔ یہ ۱۱۸۳ھ (۱۷۶۹ء) کو مہم میں پیدا ہوئے جو رہتک سے حصار کو جانے والی سڑک پر روہتک سے ۳۰ کیلومٹر پر واقع ہے۔ والد مجذوب تھے، اس لئے ان کی تربیت کا بار تمام تر ان کی والدہ ماجدہ پر پڑا۔

شاہ محمد رمضان معروف بہ ہادی ہریانہ نے شاہ عبدالقادر دہلوی کی نگرانی میں تعلیم پائی۔ چودہ سال تک علوم ظاہری و باطنی سے فیض یاب ہوتے رہے۔ منگل اور جمعہ کو شاہ عبدالقادر دہلوی کے بڑے بھائی حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۱۷۴۶ء-۱۸۲۴ء) سے بھی استفادہ کرتے تھے۔ دہلی میں یہ سلسلہ تعلیم ۱۷۸۳ء سے ۱۷۹۶ء تک چلتا رہا۔ ان کے علاوہ انہوں نے اور بہت سے بزرگوں سے کسب فیض کیا۔ حضرت شاہ محمد رمضان، شخصیتِ کثیر الجانبہ کے مالک تھے۔ بقول حافظ محمود شیرانی[1]:

> ''وہ ہریانہ دیس کے صحیح معنوں میں مصلح اور ہادی ہیں، ان کی عملی زندگی کے کئی پہلو ہیں یعنی فقہی روحانی، اصلاحی اور ادبی...''

ہادی ہریانہ اپنے درویشوں کی معیت میں سال کے گیارہ مہینے وطن سے باہر رہتے، یہ ہریانہ کے گاؤں گاؤں گھومتے اور معاشرہ میں رائج بدیوں، مخصوصاً دختر کشی کے خلاف پند و وعظ فرماتے، جہاں مسجد نہیں ہوتی وہاں مسجد تعمیر کرواتے، اور طب میں دسترس ہونے کے باعث مریضوں کا معائنہ کرتے۔ ان کے پند و وعظ میں اس بلا کا اثر تھا کہ سامعین سراپا گوش ہو جاتے تھے۔ ان کے ذریعے سے اس

[1] اورنٹل میگزین: فروری: ۱۹۳۴: ص: ۹۷

علاقے میں اسلام کو بہت فروغ ہوا۔ ہزاروں ان کے کہنے پر مسلمان ہوگئے۔ یہ ان کے پند و وعظ کا ہی اثر تھا کہ دختر کشی کی دیرینہ رسم مفقود ہوگئی۔

۱۸۲۴ء میں سات مخلصین کو لے کر فریضہ حج ادا کرنے روانہ ہوئے۔ ہر مقام پر وعظ و تذکر کی مجالس گرم رہیں۔ مدھیہ پردیش کے شہر مندسور میں کئی روز قیام رہا۔ یہاں بوہرہ جماعت نے جلسوں میں گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ حج قریب تھا، اس لئے جہاز پر سوار ہوگئے۔

حج سے واپسی پر مندسور میں پھر ایک مسجد میں قیام فرمایا اور حسب معمول محفل پند و وعظ منعقد ہوئی اچانک بوہروں نے، جو شیعوں کے خلاف تھے، ان پر حملہ کردیا و ہلاک کر ڈالا۔ یہ خوفناک واقعہ ۲۸ جمادی الاول ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸ جنوری ۱۸۲۵ء کو پیش آیا۔ انہیں وہیں دفنا دیا گیا۔ تقریباً چھ مہینے بعد ان کے حقیقی چھوٹے بھائی شاہ محمد اسمعیل مہمی، ان کی نعش مہم لائے اور اسے یہاں سپرد خاک کیا۔ ظہور نے ان کی تاریخ شہادت اس طرح کہی ہے۔

جناب شاہ رمضان قطب آفاق	سراپا معرفت عرفان مآبی
ظہور از بہر تاریخ شہادت	خرد گفتہ خوف آفتابی

حضرت رمضان نے صرف ایک شادی کی تھی۔ دو فرزند اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ لڑکے تو صغرسنی میں وفات پاگئے۔ لڑکیوں ہی سے انکی نسل چلی۔

ان کے خلفاً کی تعداد بہت تھی۔ ان میں سے ۲۴ خلفاً کے نام تذکرہ صوفیائے میوات میں درج ہیں۔

تصانیف۔ رسالہ ''ردّ روافضل'': ایک شیعہ عالم کے سوالات اور فارسی میں ان کے جوابات۔ بعض بزرگوں کی شان میں فارسی قصائد اور شاہ غلام جیلانی کے نام فارسی میں خط ہے۔

شیخ عبدالحق کرنالی

یہ ایک عالم و فاضل انسان تھے اور انشأ میں ان کو عبور حاصل تھا۔ علم طب سے بھی خوب واقف تھے۔ ۲۱ شعبان، ۱۱۱۳ھ (۱۱ جنوری، ۱۷۰۲ء) کو عہد عالمگیری مین وفات پائی۔

شاہ عبدالحکیم مہمی

حضرت شاہ عبدالحکیم مہمی ، شاہ لطف اللہ کے فرزند اور شاہ کمال اللہ کے بھتیجے تھے۔ ان کا خاندان علم و فضل میں ہمیشہ ممتاز رہا ہے، یہ مہم کے رہنے والے تھے جوکہ ضلع روہتک میں واقع ہے یہ ۱۱۲۱ھ (۱۷۰۹ء) میں لاہور میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد منصب پنج ہزاری پر فائز تھے اور ساتھ ہی کتاب خانہ کے کتابدار بھی تھے۔ ہمیشہ خلق خدا کی خدمت مین مصروف رہتے تھے ہمیشہ محتاجاں اور نیازمندان کی مدد کرتے رہتے تھے۔

۲ جمادی الثانی کو پیر کے دن ۱۱۸۷ھ (۱۷۷۳،۸،۲۱ء) کو انتقال کیا اور اپنے والد شاہ لطف اللہ کے پائین اندرونِ مقبرہ زیر حویلی واقع مہم دفن ہوئے۔

ان کی ایک تصنیف ''رسالہ علم الفرائض'' فارسی زبان میں ہے۔

ملا عبدالرحمٰن اخوان زادہ نارنولی

ان کا وطن مالوف نارنول تھا۔ ان کا شمار نارنول کے علماء اور فضلاء میں ہوتا تھا۔ وہاں کے اکثر لوگ یا تو ان سے پڑھتے تھے یا فیض حاصل کر چکے تھے۔ چونکہ ان کے والد محترم ، ملا محمد نارنولی وہاں کے علمائ و فضلا میں سے تھے، اسی اعتبار سے لوگ ملا عبدالرحمٰن کو اخوان زادہ کہتے تھے۔انہوں نے ۱۶۲۲ء ، عہد جہانگیری میں وفات پائی۔

عبدالرحمٰن پانی پتی

قاری محمد انصاری کے بیٹے، اپنے زمانے کے مشہور فقیہ اور عالم تھے۔انہوں نے مولوی سید محمد حاجی قاسم ،مولوی رشید الدین خاں اور مولانا مملوک علی سے تعلیم حاصل کی۔انہوں نے قرآن مجید کی تعلیم سید امام الدین امروہی سے حاصل کی تھی ۔ اس کے علاوہ مختلف علوم کی تعلیم ، دوسرے علمای عصر سے حاصل کی ۔ ان میں مولانا مملوک العلی نانوتوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ حضرت ولی اللہ محدث دہلوی

کے خاندان سے بھی استفادہ کیا۔ بعد میں تعلیم کی تکمیل کے لئے باندہ چلے گئے، جہاں نواب ذوالفقار الدولہ نے ان کا وظیفہ مقرر کردیا تھا۔ وہاں ۱۶سال درس وتدریس میں مشغول رہے۔ایک زمانے کے بعد پانی پت واپس آئے اور اپنے ہموطنوں کو مستفیض کرنے لگے ۔ ہمیشہ قرآن اور حدیث کی خدمت میں مشغول رہے ۔بعض رسائل اور کتب ان سے یادگار ہیں ۔ان کے شاگردان کی تعداد بی شمار ہے۔ ۶ ربیع الثانی ۱۳۱۴ھ (۱۴ اگست، ۱۸۹۶ء) پانی پت میں انتقال کیا۔

عبدالعزیز تھانیسری

عبدالعزیز تھانیسری نے رقص اور موسیقی سے متعلق ایک تصنیف کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ان کے بارے میں زیادہ تو کچھ نہیں ملتا، لیکن کچھ حوالوں سے اتنا ضرور پتا لگتاہے کہ یہ سلطان سکندر لودھی (۱۴۸۸-۱۵۱۷ء) کے زمانے میں بقید حیات تھے۔

تجھر نے ان کا نام عبدالعزیز لکھا ہے اور موجمدار نے ان کا نام عبدالعزیز شمس لکھا ہے اور صوفیاے میوات میں عبدالعزیز دہلوی ہے ۔ شیخ نجم الحق عرف چاپن سہنہ لدہ پلولی آپ کے بہت معروف جانشینوں میں سے تھے ۔ جب ۹۹۹ھ (۱۵۹۰ء) میں شیخ بیمار ہوئے اور فوت کر گئے تو مرتے وقت انہوں نے شیخ عبدالعزیز کے بیٹے قطب عالم کو جو شاہی فوج میں دلی میں تھا، اپنے پاس بلایا اور اپنا جانشین بنایا۔

عبدالعزیز حصاری

عبدالعزیز ملقب بہ محی الحصاری نے ۸۲۱ھ (۱۴۱۸ء) میں سیرۃ النبی لکھی ۔ اس میں ۱۲ مجلسیں ہیں ۔آخری مجلس میں حضرت محمد صلعم کی وفات کی تفصیلات اور پہلے چار خلفاً کی مختصر تاریخ دی ہے۔

عبدالکریم مشتاق جھجری

مشتاق جھجر کے رہنے والے تھے جو دلی سے قریب ۴۵ کیلو میٹر مغرب کی طرف واقع ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''میرات گیتی نما'' میں لکھا ہے کہ حاکم وقت نے ان کو علم نجوم سے متعلق نئے آلوں

سے آشنائی کے لئے انگلستان بھیجا تھا۔ انہوں نے ۱۸۳۹-۴۱ میں ''سیاحت نامہ'' لکھا تھا۔
انہوں نے اپنی کتاب ''میرات گیتی نما'' کے آخر میں اپنا نام خائین خاں بھی لکھا ہے۔
''میرات گیتی نما'' کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم، لندن میں موجود ہے۔

شیخ عبدالواسع ہانسوی

اردو شعر گوئی کے ابتدائی دور میں گجرات، دکن، پنجاب اور دوآبے کے شاعر مقامی بولیوں اور مخصوص محاوروں میں شعر کہتے تھے۔ جب بارہویں صدی ہجری کے قریب دلی نے ادبی مرکز کی حیثیت اختیار کرلی تو بیرونی اہل سخن کو بھی شاہجہان آباد کا روزمرہ سیکھنا پڑا تاکہ اس بین الاقوامی نئی زبان میں ملک بھر میں داد سخن حاصل کرسکیں۔

دلی سے دور رہنے والے شعرا اور ادبا کو دلی کے مخصوص محاوروں اور اصطلاحوں کے سمجھنے میں دشواریاں پیش آتی ہوں گی، انہیں دور کرنے کے لئے ماہرین زبان نے اردو لغت نویسی کی بنیاد ڈالی اور اورنگزیب (۱۶۵۸-۱۷۰۷ء) سے بہادر شاہ ظفر (۱۸۳۱-۱۸۵۷ء) آخری تاجدار دلی تک متعدد کتابیں اس فن پر لکھی گئیں۔ مولانا عبدالواسع ہانسوی کی کتاب ''غرائب اللغات'' اس کوشش کا پہلا نمونہ ہے۔

مشہور محقق سراج الدین علی خاں آرزو (۱۶۸۷-۱۷۵۶ء) نے ۱۱۵۶ھ (۱۷۴۳ء) میں اس کتاب پر تنقیدی نظر ڈالی اور عبدالواسع ہانسوی کی اس کتاب کی کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے انہیں ''نوادر اللغات'' کے عنوان سے قلمبند کیا۔

اس کے علاوہ دو اور کتابیں '' دستورالعمل '' اور بچوں کے لئے '' نصاب سہ زبان'' شیخ عبدالواسع سے یادگار ہے۔

شیخ عبدالوہاب کرنالی

ان کا شمار اپنے زمانے کے علماء وفضلاً میں ہوتا تھا۔ شعر، اور انشاً میں خاص طور پر ان کو مہارت تھی۔ ان کی متعدد تصانیف میں، جن میں ''اخلاقِ جہانگیری'' اور ''شرح قصیدہ بانت سعاد'' مشہور ہیں۔

یہ جہانگیر (۱۶۰۵-۱۶۲۷ء) کے زمانے میں بقید حیات تھے۔ طبقات شاہجہانی کے مصنف محمد

صادق دہلوی کے استاد شیخ فائض دہلوی (م:۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء) عبدالقادر بدایونی (م:۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء)، شیخ چاند دہلوی (م: ۱۰۲۹ھ/۱۶۱۹ء)، اللہ داد دہلوی (م: ۱۰۳۱ھ/۱۶۲۱ء) ان کے ہمعصر تھے۔ ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۲ء میں وفات پائی۔

شیخ عزیز اللہ مہمی

شیخ عزیز اللہ مہمی، حبیب اللہ مہمی کے بیٹے اور رزق اللہ کے والد تھے۔ آپ کا شمار اپنے زمانے کے ممتاز علماً میں ہوتا تھا۔

آپ نے ۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء میں وفات پائی۔

شیخ علی بن محمود پانی پتی

شیخ علی ابن محمود پانی پتی، اپنے عہد کے مشہور عالم تھے۔ مختلف اساتذہ سے تحصیل علم کے بعد حرمین شریفین اور القدس شریف کی زیارت کے لیے گئے۔ وطن واپسی کے بعد چند دن اجین میں اقامت اختیار کی۔ پھر وہاں سے سارنگ پور منتقل ہو گئے جہاں ان کے چچا قاضی کے عہدے پر فائز تھے۔ چچا کی وفات پر خود انہیں وہاں کا قاضی بنا دیا گیا۔

۱۱۱۱[1] ھ (۱۶۹۹ء) میں سارنگ پور ہی میں وفات پائی۔ "قاضی زندہ دل" تاریخ وفات ہے۔

عنایت خان راسخ پانی پتی

عنایت خان نام اور راسخ تخلص تھا۔ یہ نواب شمس الدولہ لطف اللہ خان صادق بہادر کے فرزند رشید تھے۔ ان کے خاندان کا تفصیلی ذکر آگے دیا گیا ہے۔

راسخ کی تاریخ ولادت کے بارے میں کہیں کچھ نہیں ملتا، وہ خود "عنایت نامہ نثر[2]" میں لکھتے ہیں:

۱۔ ۱۱۰۱ نکلتی ہے۔

۲۔ یہ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔

''بندۂ عاصی خان راسخ بن شمس الدولہ لطف اللہ خاں صادق بہادر متہو جنگ، دراین سن عبرت آگینِ خود کہ سنہ یک ہزار و یک صد و شصت و سہ ہجری (۱۱۶۳ھ) چہل و نہ مرحلہ از سلکِ زندگانی طی نمودہ و بسا اوقات چشم استفادہ بر اشعار رنگین و منشیاتِ دلنشینِ اساتذہ گشودہ، پارہ بحافظہ و پردہ برخی بحسبِ استعداد و حوصلہ بصحیفہ انتخاب بردہ بخاطر آورد کہ سابق چنان اشعار مکتوبی استادان در سلکِ انتظام کشیدہ بعنایت نامہ موسوم گردانید''

اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ راسخ ۱۱۱۴ھ (۱۷۰۲ء) میں پیدا ہوئے۔

راسخ کی چار تالیفات کا پتہ چلتا ہے۔

۱۔ رسالہ مُغنیانِ ہندوستان کے ۱۵ مغنیان پر مشتمل ہے۔ اس تالیف کی وجہ راسخ نے یہ بیان کی ہے کہ جب شعرا کا تذکرہ ہوسکتا ہے تو مغنیان کا کیوں نہیں ہوسکتا۔ اس لئے مؤلف نے عبد المجید لاہوری کے شاہجہان نامہ اور سکندر بن محمد کی ''مرأت سکندری'' سے استفادہ کر کے یہ کتاب تالیف کی اور مغنیان ہند کے بارے میں مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ یہ رسالہ ۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ آغاز میں یہ کلمہ ہے

''آئینہ ضمیر منیر دانشورانِ صاحب نظر و مرأت باطن تجلی موطن روشن دلانِ دیدہ درعکس پذیر صورت این معنی باد...''

۲۔ عنایت نامہ۔ یہ کتاب شعرای قدیم و جدید کا انتخاب ہے۔ یہ ۱۴ اباب اور ایک سو فصل پر مشتمل ہے۔ اس کا سن تالیف ۱۱۵۳ھ (۱۷۴۰ء) ہے۔ اس کا قلمی نسخہ بھی خدا بخش لائبریری بانکی پور، پٹنہ میں موجود ہے۔ اس میں ۵۲ اوراق ہیں۔

اس انتخاب کا اصل مقصد، شعرائے قدیم و جدید کے وہ اشعار جمع کرنا تھا جو انہوں نے اکثر و بیشتر مکتوبات میں استعمال کئے ہیں۔ روز مرہ کی خط و کتابت میں اشعار کو جابجا استعمال کرنے سے خط کی تحریر میں عجیب لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا پہلا باب تہنیت اور مبارکباد کے اشعار پر اور آخری باب مختلف مطالب کے اشعار پر، جن کی اکثر تقریبات اور تحریر میں ضرورت پڑتی ہے، مشتمل ہے۔

۳۔ فالہائے حافظ شیرازی۔

یہ رسالہ ۲۷ صفحوں پر مشتمل ہے۔ محمد واسع اس کے کاتب ہیں۔ مؤلف نے اشعار دیوان حافظ سے لئے ہیں اور عربی زبان کے اقتباسات بھی درج کئے ہیں۔ یہ رسالہ خط شکستہ میں لکھا ہوا ہے۔

دیوان حافظ سے فال نکالنے کا رواج زمانۂ قدیم سے چلا آراہا ہے ۔ مؤلف نے جابجا داستانیں دے کر اسے دلچسپ بنا دیا ہے۔

۴۔عنایت نامہ نثر۔

یہ مجموعہ ان خطوط پر مشتمل ہے جو پادشاہان تیموریہ (ہمایوں سے لیکر بہادر شاہ تک) کو لکھے گئے یا انہوں نے دوسروں کو لکھے ۔ اس کتاب کی ضخامت ۱۸۱ صفحے کی ہے ۔ پٹنہ یونیورسٹی کے کتابخانے میں اس کا جو قلمی نسخہ ہے، اس میں ۴۶۶ صفحات ہیں۔

یہ ایک گرانقدر مجموعہ ہے ۔قیمتی تاریخی اطلاعات کے علاوہ ادبی اہمیت سے بھی خالی نہیں ۔

یہ عنایت نامہ سے ، جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، مختلف تالیف ہے۔

مولوی عماد علی سونی پتی

مولانا سید عماد علی بن سید نظام علی ۱۲۴۴ھ میں سونی پت میں پیدا ہوئے تھے۔ابتدائی تعلیم دہلی میں قاری جعفر علی اور دوسرے اساتذہ سے حاصل کر کے لکھنؤ میں جناب ممتاز العلماء سید ابراہیم صاحب سے فقہ و اصول و تفسیر حدیث و کلام کا درس لیا۔ چونکہ زمیندار تھے، اس لئے کہیں نوکری کرنے کی ضرورت نہیں پڑی ۔ یک شنبہ ماہ صفر ۱۳۰۴ھ (۱۸۸۶ء) کو رحلت فرمائی اور امام باڑہ قاضی علیم الدین محلہ قاضی زادگان کے دالان میں دفن کیے گئے ۔

مولانا ایک پرہیز گار ، عابد ، متوکل و قانع تھے ۔ حجاز ، عراق ، یمن وشام ، ایران کے تمام مقامات مقدسہ کی زیارت اور فریضہ حج انجام دیا۔انہوں نے ضلع روہتک میں بڑی تبلیغ فرمائی ۔ فارسی میں ''دفع المغالطہ'' اور ''دلایل التزامیہ'' دو مطبوعہ یادگار چھوڑی ہیں ۔

مولانا سید محمد احمد شاہ ان کے فرزند تھے ۔انہوں نے ۱۹۵۵ء کے بعد لاہور میں وفات پائی ۔

غلام احمد بھکن صدیقی ہانسوی

انہوں نے ''اشہرۃ اللغت'' کے نام سے فارسی -عربی کی ضخیم لغت تالیف کی جس میں عربی الفاظ کے معنی فارسی میں دئے گئے ہیں ۔ یہ لغت پہلے اور آخری حرف کے مطابق الفبا ے کے حساب

سے ترتیب دی گئی ہے ۔ یہ ۱۰۸۲ھ (۱۶۷۱ء) میں تالیف کی گئی اور اورنگزیب (۱۶۵۸-۱۷۰۷ء) کو نذر کی گئی تھی ۔ یہ بہت نادر لغت ہے اور بیشتر لوگوں کو اس کے بارے میں علم بھی نہیں ہے۔ اس کے قلمی نسخے ایشیاٹک سوسائیٹی کلکتہ (۱۴۳۳) ، خدابخش لائبریری پٹنہ (۸۰۵) (۱۰) اور انڈیا آفس ،لندن میں موجود ہیں ۔

غلام الحسنین پانی پتی

مولانا خواجہ غلام الحسنین پانی پتی اپنے عہد کے فعال اور صاحبِ فکر عالم تھے انگریزی پر قدرتِ کامل رکھتے تھے اور بحیثیت مقرر و مصنف و مصلح معروف تھے۔ انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں اور بہت سے ادارے قائم کیے۔ حالی مسلم اسکول پانی پت میں مدیر و استاد عربی و فارسی تھے۔

۱۹ رمضان ۱۳۵۶ (۱۳ نومبر ۱۹۳۷ء) کو رحلت فرمائی ۔

تصانیف : سیرۃ النبی ۔ تقدیس القرآن ۔ معیار الاخلاق ۔ کشف الحقیقت ۔ اخلاق حسینی ۔ سفرنامۂ حج ۔

غلام محمد خاں جھجری

۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) میں انہوں نے خواجہ محمد سلیمان چشتی تھانیسری کی شاگردی اختیار کی اور اسی سال "مناقب سلیمانی" کے نام سے خواجہ صاحب موصوف کی سوانح عمری لکھنی شروع کی اور یہ خواجہ موصوف کی وفات (۱۸۷۱ء) تک جاری رہی ۔ یہ سوانح عمری دلی سے ۱۸۷۱ء میں اور جھجر سے ۱۸۹۷ء میں شایع ہوئی۔

حافظ غلام مصطفیٰ تھانیسری

حافظ غلام مصطفیٰ بن محمد اکبر تھانیسری دہلوی کے اپنے بیان کے مطابق ، جو کہ ان کی تفسیر کے دیباچے میں قلمبند ہے، وہ ایک مفصل طبی اثر بنام "طب مصطفوی' ایک فارسی تفسیر اور علم دین پر بہت سے رسالوں کا مصنف ہے۔

۱۔بحرالعلوم الاسلامیہ یا التفسیر المصطفوی ۔ یہ ایک مفصل تفسیر ہے جو ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۸ء میں تالیف ہوئی ۔
اس مین ۱۱علوم کا ذکر ہے، جوحسب ذیل ہیں :

۱۔	رسم الخط	۲۔	وقوف
۳۔	تجوید	۴۔	عقاید اہل السنی والجامعہ
۵۔	تفسیر	۶۔	قرأ راہ
۷۔	فقہ	۸۔	تصوف
۹۔	سلوک	۱۰۔	معرف وحقیق
۱۱۔	حدیث نبوی		

اس تفسیر کے متن کی املأ کے بارے میں یادداشتیں ان قرآنوں میں چھپی ہیں جو۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) اور ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں لکھنؤ میں ، ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء)، ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں دلی اور ۱۲۸۴-۸۵ھ (۱۸۶۷-۶۸ء) میں میرٹھ اور ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں لاہور سے شائع ہوئے ہیں ۔

ان کی ایک اور تصنیف ''مادۃ القادریہ'' ہے۔

''بحرالعلوم''الاسلامیہ'' کے قلمی نسخے آصفیہ لائبریری اور رامپور میں موجود ہیں۔

حضرت شاہ غلام نبی فیروز پور جھرکہ

شیخ المشائخ حضرت شاہ غلام نبی ، اپنے دور میں سلسلہ نقشبندیہ کے میوات میں بڑے اہم ستون تھے۔تربیت اور سلوک میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔حضرت میاں لال خان کوٹ قاسم کے خلفاء میں سے تھے اور اس سلسلے کی نشرو اشاعت میوات کی حد تک انہی سے وابستہ تھی ۔ان کی پیدائش اور ابتدائی حالات تو معلوم نہیں ہو سکے ، البتہ تاریخ وفات ۲۱رمضان ۱۱۵۷ھ (۱۷۴۴ء) ہے ۔ ان کا مزار فیروز پور جھرکہ میں نئی عید گاہ کے پاس ہے ۔ان کی خانقاہ اندرون قلعہ نواب خاں زمان خاں پیر جی والی مسجد میں تھی ۔

ان کے خلفأ کی تعداد تو معلوم نہیں ، البتہ خواجہ محمد شعیب ''تجاروی'' ان کے سب سے بڑے خلیفہ تھے۔

ان کا ایک قلمی منظوم رسالہ ''پند نامہ'' ہے جو میاں محمد شعیب صاحب کے خاندان سے متعلق

دوسرے قلمی رسائل کے ساتھ مجلد ہے۔ اس کے آخر میں فارسی عبارت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پندنامہ بھی فارسی میں ہوگا۔

فخر الدین ہانسوی

اپنے زمانے کے مشہور مدرس تھے عمر کا بیشتر حصہ فیروز آباد مین گزارا۔ یہاں ان کے شاگردوں کی بہت بڑی تعداد تھی، جن میں کمال الدین ہانسوی، شیخ نصیر الدین محمود اودھی اور فخر الدین زرادی زیادہ مشہور ہیں۔ ان کی تصنیف ''دستور الحقائق'' اپنے فن میں مشہور کتاب ہے۔

یہ محمد شاہ تغلق (۱۳۲۵-۱۳۵۱) کے عہد میں ہوئے تھے

شیخ فرخ نارنولی

مشہور عالم وفقیہہ اور بلند مرتبہ عارف باللہ حضرت شیخ نظام الدین چشتی نارنولی کے پوتے تھے۔ نارنول میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ اپنے والد اور دادا سے علم حاصل کیا۔ پھر وہ خود عالم و فاضل ہوکر اپنے دادا اور والد کے جانشین ہوئے اور اپنے آبائی مسند، مشیخت کو زینت بخشی۔ نہایت بارعب اور عالی مرتبت شیخ تھے۔ معارف الٰہیہ کی توضیح وتشریح میں یگانہ تھے۔ وجد وسماع میں شغف تھا۔ ۱۰۳۶ھ کو نارنول مین وصال ہوا۔

شیخ قطب الدین منور ہانسوی

یہ شیخ برہان الدین جمال الدین ہانسوی کے بیٹے اور نظام الدین اولیاً کے خلفاً میں سے تھے۔ شور شرابے سے دور تنہائی میں رہنا پسند کرتے تھے۔ ساری عمر کبھی اپنے حجرے سے باہر نہیں نکلے اور کبھی امرا اور بادشاہوں کے دروازے پر نہیں گئے۔ اس وقت کے سلطان محمد تغلق (۱۳۲۵-۱۳۵۱ء) نے قاضی کمال الدین صدر جہاں کو کچھ جگہوں کے پٹوں کے ساتھ شیخ قطب الدین منور کے پاس بھیجا تا کہ ان کی توجہ کو دنیا کی طرف مایل کرے۔ قاضی کمال الدین نے زمینوں کے پٹے شیخ کے سامنے رکھے اور بادشاہ

نے جو کچھ کہا وہ ان کو بتا دیا۔ منور ہانسوی نے پیشکش کو نامنظور کرتے ہوئے کہا:
"ہمارے پیروں نے ایسا نہیں کیا ہم بھی نہیں کرسکتے۔"

شیخ قطب الدین کی ملاقات بادشاہ سے تب ہوئی جب وہ بستی سے چار کوس دور ٹھرا ہوا تھا۔ بادشاہ نے کسی کو شیخ کو بلانے کے لئے بھیجا۔ اپنے اصول کے خلاف شیخ قطب الدین، بادشاہ تغلق سے ملنے گئے۔ بادشاہ نے ان کو دو ہزار ٹکے دئے جو انہوں نے غریب غربا میں بانٹ دئے اور کچھ اپنے پیرویاں کے خرچے کے لیے رکھ لیے۔

یہ عالم و فاضل آدمی تھے اور دینیات کے ماہر تھے۔ ان کی ایک تصلیف "اسلام کے دھارمک سنستھانوں کی ویاکھیا" کا اردو ترجمہ ۱۹۳۳ میں شایع ہوا تھا۔

سید تاج الدین شیر سوار نارنولی، ان کے مریدوں میں سے تھے جو ہر سال ان کی زیارت کو ہانسی جاتے تھے۔ شیخ قطب الدین منور نے ۷۵۷ھ (۱۳۵۶ء) میں وفات پائی۔

منشی گوبند نراین صبا نارنولی

گوبند نراین نام اور منشی لقب اعزازی بطور اسمی جز لاینفک۔ اس لئے کہ آپ کے بزرگ اس کو اپنا فخر و اعزاز سمجھتے تھے۔ آج کی دنیا میں اس لفظ کی نسبت کوئی کچھ بھی رائے رکھے، مگر حقیقت میں منشی ہونا آسان نہیں تھا۔ اصلی وطن نارنول تھا۔ لیکن بعد میں مستقل طور پر جے پور میں سکونت اختیار کرلی تھی۔

گوبند نراین شہنشاہ جہانگیر [۱۶۰۵-۱۶۲۷ء] کے نائب وزیر اعظم رائے مکند کی اولاد میں سے تھے اور انکے جد امجد منشی نندکشور، مہاراجہ سوائی رام سنگ کے میر منشی اور جے پور کی نہایت مقتدر و محسن عام ہستی تھے۔ انہی بزرگ کو ریاست سے معقول جاگیر بھی عطا ہوئی۔

منشی گوبند نراین فارسی کے جیّد عالم تھے۔ ان کی فارسی تصنیف "انشاء گوبند نراین" نے راجپوتانہ [راجستھان کا پرانا نام] میں خاصی شہرت حاصل کی تھی۔

مشہور اردو شاعر منشی چندر بہاری لعل صبا[1] انہی کے بیٹے تھے۔

[1] تاریخ ولادت: ۲۵ دسمبر ۱۸۹۵ء۔ تذکرہ شعرائے جے پور۔ ۳۰۳

شاہ لطف اللہ انبالوی

شاہ لطف اللہ انبالوی، شاہ چشتی لاہوری کے مرید اور صاحب علم و عمل تھے۔ اپنے مرشد کے خرق عادات اور کرامات کے ذکر میں "ثمرۃ الفواد" تالیف کی۔

۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء میں انتقال ہوا۔

محمد ابوالحسن فرید آبادی

انہوں نے آگرہ کے مظفر علی شاہ الٰہی کی "تذکرہ الٰہی" کے نام سے سوانح عمری لکھی ہے۔ ۱۲۲ صفحوں پر مشتمل یہ کتاب ۱۸۸۷ء میں لکھنؤ سے شایع ہوئی تھی۔

شاہ محمد اسمٰعیل مہی

شاہ محمد اسمٰعیل، شاہ عبد العظیم کے فرزند اور ہادی ہریانہ حضرت شاہ محمد رمضان کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۵ء) میں مقام کاہنور، ضلع روہتک میں پیدا ہوئے۔ کاہنور راجپوتوں کا ایک مشہور قصبہ تھا۔ یہیں پر انہوں نے ایک راجپوت خاتون کا دودھ پیا تھا۔ جسے ان کی اولاد تعظیم کے ساتھ "دادی چھونہ" کے نام سے یاد کرتی ہے۔

ان کا قد درمیانہ اور گندمی گول چہرہ تھا، دستار باندھتے تھے۔ اکثر انگرکھا اور غرارے دار جامہ اور نری کی پاپوش استعمال کرتے تھے۔

ان کا شمار اپنے زمانے کے مشہور علماء اور فضلاء میں ہوتا تھا۔ فن موسیقی پر ایک رسالہ لکھا۔ علم طب کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ شعر کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ان کے مندرجہ ذیل تصنیف کردہ یا نقل کردہ رسائل اب بھی محفوظ ہیں۔

ریاض الادویہ (تصنیف عہد ہمایونی)، رسائل طریق الہدیٰ اور اظہار اخفا (از شاہ غلام جیلانی)، رسالہ فنا (از شاہ شرف الدین یحییٰ منیری)، ہدایت الطالبین اور ارشاد السالکین فضل المتاخرین - از مولانا

عضدالدین۔

محمد اسمعیل کی تین بیاض بھی محفوظ ہیں۔ ایک میں دعائیں، عملیات اور آئینہ احمدی ہیں۔ دوسری میں غزلیں نظمیں اور تیسری میں اپنے سفر لکھنؤ اور الہ آباد (۱۲۳۷ھ/۱۸۲۱ء) کے حالات ہیں۔

انہوں نے بہت سے بزرگوں کی صحبت میں رہ کر راہ سلوک طے کی۔ الہ آباد میں بھی شاہ محمد فاخر کے خاندان سے استفادہ کیا۔ یہ حضرت غلام جیلانی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ سلسلہ قادریہ چشتیہ ان سے ہی جاری ہوا، ان کے صرف چار خلفاءً کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔ ان کے فرزند مولوی سیف الرحمٰن شہید جنگ آزادی، حافظ سراج الدین حافظ لکّھا، ساکن موضع باہمن والا ضلع حصار اور حضرت راج شاہ آخر الذکر کے حالات پر ایک کتاب ''ملت راج شاہی'' طبع ہوئی۔ ان کا مدفن سوندھ ضلع گوڑگانوہ میں ہے۔ صوفیائے میوات میں ان سے زیادہ محترم شخصیت نہیں گزری ہے۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے وقت ان کی عمر ۷۳-۷۴ برس تھی۔ انگریزوں کی ایک فوج بھوانی سے مہم آرہی تھی۔ مہم کے تحصیلدار اور نمبردار نے اسمعیل کے خلاف افسر کے کان بھر دئے کہ وہ اور اس کا خاندان شر و فساد کا بانی تھا۔ چنانچہ شاہ اسمعیل اور ان کے فرزند کو گرفتار کرلیا گیا۔ ان کو حصار اور ان کے فرزند کو روہتک بھیج دیا گیا۔ جائداد ضبط کرلی گئی اور گھر کا سارا سامان نیلام کردیا گیا۔

جمادی الآخر کی ۲۸ تاریخ ۱۲۷۴/۱۳ فروری ۱۸۵۷ء کو صبح کے وقت ہیضہ میں مبتلا ہوگئے اور اسی روز ابتلا میں جان شیرین جان آفرین کے حوالے کردی۔ لیکن عام روایت یہ ہے کہ ان کو حصار میں پھانسی دی گئی تھی۔ اور ان کی شہرت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہانی گھڑی گئی کہ ان کی موت ہیضہ سے ہوئی۔

محمد اکبر براسوی

محمد اکبر بن شیخ محمد علی بن شیخ اللہ بخش الحنفی البراسوی، شیخ سوندہ سفیدوانی کے شاگرد تھے اور انہی کے ہاتھوں ان کو خرقہ خلعت حاصل ہوئی۔

انہوں نے ۱۶۹۹ء میں دلی میں سواتی الانوار لکھنی شروع کی جو ۱۷۲۹ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

سواتی الانوار چشتیہ سلسلہ پر ایک بہت ہی ضخیم کام ہے اور یہ چار باب پر مشتمل ہے جنہیں اقتباس بھی کہتے ہیں۔

محمد بن شیخ ضیا تھانیسری

محمد بن شیخ ضیا ''تحفۃ السعادت'' یا ''فرہنگ سکندری'' کا مصنف ہے۔ مصنف نے اس کتاب کا آغاز منظوم مقدمہ سے کیا ہے جس میں حاکم وقت سکندر لودھی (۱۴۸۸-۱۵۱۷ء) اور اپنے سرپرست اور محسن شیخ سعید، جو سعید الدین کے نام سے بھی مشہور تھے، کی ستایش کی ہے۔ محمود تھانیسری نے یہ فرہنگ ۱۰ اصفر ۹۱۶ھ (۱۹ مئی ۱۵۱۰ء) کو تدوین کی تھی۔

محمد علی انصاری پانی پتی

لطف اللہ خاں صادق نیک نام متہور جنگ کے چھ (یا سات) فرزند تھے۔ ان میں سے دوسرے بیٹے ھدایت اللہ خاں کی شادی، اپنے چچا شکر اللہ عزت الدولہ (م: ۱۲ ربیع الاول ۱۱۴۳ھ ۱۱۴/اکتوبر ۱۷۳۰ء) کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ ان سے محمد علی انصاری اور محمد جعفر راغب پیدا ہوئے۔ (محمد جعفر راغب کا ذکر شعرا کے باب میں ہے)

محمد علی انصاری کے حالات نہیں ملتے ''رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان بہشت نشان'' میں صرف اتنا ذکر آیا ہے کہ یہ ''تاریخ مظفری'' کے مولف تھے۔

محمد بن محمود پانی پتی

محمد پانی پتی، شیخ جلال الدین محمد پانی پتی ملقب بہ اکبر الاولیاء کے بیٹے تھے۔ وہ صغر سنی ہی میں تصور کی طرف مایل ہوگئے تھے۔ انہوں نے مختلف مقامات کے بزرگوں کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ خود شمس الدین ترک پانی پتی کے مرید اور انہیں کے جانشین ہوئے۔ بہت سے صوفیا نے ان سے فیض حاصل کیا۔ ان کی کتاب ''زاد الابرار'' حقائق و معارف کا خزینہ ہے۔ انہوں نے اپنی عمر میں دو دفعہ حج کیا: ۱۳ ربیع الاول ۷۶۵ھ (۲۰ دسمبر ۱۳۶۳ء) کو وفات پائی اور پانی پت میں دفن ہوئے۔

حاجی محمد سلطان تھانیسری

حاجی محمد سلطان تھانیسری نے مکہ و مدینہ کی زیارت کی تھی۔ علوم عقلیہ میں خوب دستگاہ حاصل تھی۔ ایک لمبے عرصے تک اکبر بادشاہ کی خدمت میں رہے اور ان کے حکم سے سنسکرت سے مہابھارت کا آزادانہ فارسی میں ترجمہ کیا اور چار سال میں اسے مکمل کیا اور اس کا نام ''رزم نامہ'' رکھا۔ دراصل اس ترجمہ کی بنیاد نقیب خاں[1] نے ڈالی تھی۔ حاجی محمد سلطان کو ابوالفضل کی سرپرستی کا سایہ حاصل تھا۔ جب یہ مہابھارت کا ترجمہ کر رہے تھے تو کسی نے ان سے پوچھا۔ کیا ہو رہا ہے؟ انہوں نے جواب دیا۔ دس ہزار پرانے الفاظ کو آج کی مروج زبان میں ڈھال رہا ہوں۔

ایک بار انہوں نے ایک گائے کو مار دیا تھا، جس کی وجہ سے ہندو بہت ناراض ہوئے اور ان کو 'بھکر' کی طرف بھاگنا پڑا تھا۔ خانخانان نے غائبانہ طور پر ان کے گناہوں کو معاف کروادیا تھا۔ پھر ابوالفضل کے توسط سے تھانیسر اور کرنال کے کروڑی مقرر ہوئے۔ جب اکبر بادشاہ کا ادھر سے گذر ہوا تو ہندوؤں نے پھر دادخواہی کی۔ بادشاہ کے حکم پر وہیں پر ۱۰۰۸ھ (۱۵۹۹) میں قتل کر دیا گیا۔

مہابھارت کے ترجمے کا ایک نسخہ برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے۔

محمد صادق انبالوی

''آدابِ عالمگیری'' ان مخطوط اسناد اور خطوط کا مجموعہ ہے جو اورنگ زیب (۱۶۵۸-۱۷۰۷ء) کے منشی الملک شیخ ابوالفتح مخاطب بہ قابل نے اپنے آقا کو لکھے تھے۔ ''صادق مطلبی نسب'' نے ان کو جمع کر کے مرتب کیا۔ مؤلف کے بارے میں زیادہ حالات تو معلوم نہیں ہو سکے، لیکن ریو کے مطابق ''آدابِ عالمگیری'' کے دیباچہ میں مؤلف نے اپنے آپ کو توابع سرہند کا ساکن بتایا ہے۔ اس کتاب کے نقل نویس نے کتاب کے آخر میں مؤلف کا نام محمد صادق لکھتے ہوئے مزید اضافہ کیا ہے کہ مؤلف نے یکم محرم ۱۱۲۷ھ (۲۷دسمبر ۱۷۱۴ء) کو وفات پائی۔ لیکن محمد اشرف، جنہوں نے مؤلف کا نام محمد صادق انبالوی لکھا ہے، کے مطابق محمد صادق نے ۱۱۲۹ھ (۱۷۱۶ء) میں وفات پائی۔

[1] نام غیاث الدین اور لقب نقیب خاں تھا، وفات ۱۶۱۴، اجمیر میں: بیلے۔ ۴۱۸

ریئو لکھتے ہیں کہ کتاب کے دیباچہ میں آیا ہے کہ محمد صادق نے یہ کتاب اپنے بیٹے محمد زمان کی درخواست پر قلمی مسودہ سے استفادہ کرتے ہوئے ۱۱۱۵ھ (۱۷۰۳ء) میں تالیف کی اور اس میں حسب ذیل اضافہ بھی کیا۔

۱۔ شاہجہاں کی بیماری (۱۶۵۸-۱۶۶۶ء) کے دوران خانہ جنگی اور بیٹوں کے باہمی نزاع کے حالات درج کئے ہیں۔

۲۔ اپنے وہ چند خطوط بھی جو اس نے پادشاہ، محمد اکبر (اورنگزیب کا چوتھا بیٹا) اور دربار کے دیگر رجال کو لکھے تھے، شامل کیے۔

آداب عالمگیری کے قلمی نسخے برٹش میوزیم، لندن، انڈیا آفس لائبریری لندن، ایشیا ٹک سوسائٹی، بنگال، بانکی پور اور سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں موجود ہیں۔

مولوی نجف علی جھجری

مولوی نجف علی المخاطب بہ تاج العلماً جھجر کے رہنے والے اور وہاں کے مشہور قاضی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد کا نام سید محمد عظیم الدین تھا۔

مولوی نجف علی خاں عربی اور فارسی کے فاضل تھے اور شعر بھی کہتے تھے۔ خستہؔ اور ملہمیؔ دو تخلص تھے۔ یہ اپنے زمانے کے نامی گرامی فاضل تھے اور اپنے ہمعصروں میں ممتاز تھے۔ نظم و نثر کی متعدد کتابیں ان سے یادگار ہیں۔ کچھ سنکی قسم کے آدمی تھے۔ مولوی نظیر حسین سخاؔ (۱۸ فروری ۱۸۸۲ء-۸ فروری ۱۹۳۳ء) بھی انہی کے خاندان میں سے تھے۔

مولوی نجف علی، عین الدولہ وزیر الملک محمد علی خاں بہادر صولت جنگ فرمانروائے محمد آباد (ٹونک) کے یہاں ملازم تھے۔ وہیں پر ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۰ء) میں فوت ہوئے اور ٹونک کے قبرستان موتی باغ (حصہ دوم) میں مدفون ہیں۔

ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

کامل الاسعاد

محمد صادق انبالوی کی ایک اور تصنیف ''احکام عالمگیری'' بھی ہے۔

ہریانہ کا اتہاس: ۲: ۲۳۷ (ہندی)

شرح قصیدہ بانت سعاد

شرح حماسہ حاشیہ مطول یمزا

سفرنگ دساتیر۔ اس پر غالب نے تقریظ لکھی تھی۔

کلمہ صولت فاروقی۔ (پچاس ہزار سے زیادہ اشعار)

شرح دیوان متنبی

دافع ہذیان۔صفوی دور مین فارسی فرہنگیں بہت لکھی گئیں ہندوستان میں بھی فرہنگ جہانگیری (۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء)، فرہنگِ رشیدی (۱۰۶۴ھ/۱۶۵۳ء غیاث اللغات (۱۰۳۰ھ/۱۶۱۱ء)، انجمن آرا وغیرہ کے علاوہ برہان قاطع بھی اسی دور مین لکھی گئی تھی۔

برہان قاطع کا مصنف محمد حسین بن خلف تبریزی متخلص بہ برہانؔ تھا۔ یہ فرہنگ ۱۰۶۰ھ (۱۶۴۹ء) میں ختم ہوئی اور دکن گولکنڈہ کے بادشاہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے نام معنون کی گئی تھی۔[1] رُوبیک نے اسے مرتب کر کے کلکتہ سے چھپوایا تھا۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے دوران جب مرزا غالبؔ کا گھر سے نکلنا بند ہوگیا تو امرارِ وقت کی غرض سے انہوں نے مطبوعہ برہان قاطع کی ورق گردانی شروع کی اور جہاں بھی اس میں کوئی غلطی دیکھی، اسے حاشیہ میں لکھتے گئے۔ یوں انہوں نے اس پر کافی حواشی لکھ دیے۔ جب ایک دن نیر رخشاں (۱۸۲۱ء-۱۸۸۵ء) کی ان حواشی پر نظر پڑی تو انہوں نے غالب کو مشورہ دیا کہ اگر ان حواشی کو جمع کر کے چھپوا دیا جائے تو بہت مفید ہوگا۔ غالب کو یہ مشورہ پسند آیا اور ان حواشی کو "قاطع برہان" کے نام سے ۱۸۶۲ء میں چھپوادیا۔ اس کتاب کا شایع ہونا تھا کہ ہندوستان کے فارسی داں کے حلقے میں گویا بھونچال آگیا۔ اس کے جواب میں کئی کتابیں لکھی گئیں۔ اس کے جواب میں سب سے پہلے سید سعادت علی کی کتاب "محرق قاطع برہان" چھپی۔ اس کے جواب میں تین رسالے لکھے گئے۔ سب سے پہلا رسالہ جو فارسی زبان میں لکھا گیا۔ وہ مولوی نجف علی جھجری کا "دافع ہذیان" تھا۔

دافع ہذیان، ۲۸ صفحوں پر مشتمل مختصر سی کتاب ہے جو قاطع برہان کی تائید میں چھپی تھی۔[2]

---

[1] تاریخ ادبیات ایران: ۵۰۵

[2] ذکر غالب (اردو): ۱۷۶

نظام پانی پتی

ریو نے اپنی فہرست میں لکھا ہے کہ ثناء اللہ پانی پتی ان کے بیٹے تھے۔ ڈی. این. مارشل کی فہرست کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سنسکرت کی مشہور کتاب، ''جوگ وشِشٹ'' کا فارسی ترجمہ کر کے اسے شاہزادہ سلیم (بعد میں بادشاہ جہانگیر) کو پیش کیا تھا۔ ''یوگ وشِشٹ'' کے قلمی نسخے ایشیاٹک سوسائیٹی، بنگال، انڈیا آفس لائبریری اور برٹش موزیم، لندن میں ملتے ہیں۔

ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی صاحب نے بھی ''جوگ وشِشٹ'' کو تالیف اور مرتب کیا ہے۔

نظام الدین[1] تھانیسری

ان کے والد شیخ عبدالشکور العمری (فاروقی)، جلال الدین تھانیسری کے بھائی تھے۔ گویا نظام الدین تھانیسری، جلال الدین تھانیسری کے برادر زادہ ہوئے۔ اس کے علاوہ یہ ان کے داماد، خلیفہ اور جانشین بھی تھے۔ ان کا آبائی وطن بلخ تھا۔ یہ حنفی مذہب، چشتی صابری مشرب اور خاندانی اعتبار سے فاروقی الاصل تھے۔

انکا حلقۂ ادارت بہت وسیع تھا۔ شاہنشاہ جہانگیر بھی ان کا ارادتمند تھا، لیکن چونکہ نظام الدین تھانیسری نے جہانگیر (۱۶۰۶-۱۶۲۷ء) کے باغی بیٹے[2] خسرو کو اپنے پاس پناہ دی تھی۔ اس سے جہانگیر ان

---

[1] ''جواہر زواہر'' میں ان کا نام نظام الدین احمد تھانیسیری لکھا ہوا ہے۔ ص: ۴۳

[2] نظام الدین تھانیسری کی جلاوطنی کے بارے میں مختلف تذکروں میں مختلف رائے پائی جاتی ہے، ایتھے اور مارشل لکھتے ہیں جہانگیر کا بیٹا خسرو، دوران بغاوت، نظام الدین احمد کے پاس ٹھہرا تھا۔ اسی سے جہانگیر نے ناراض ہو کر انہیں ملک سے چلے جانے کا حکم دیا تھا۔

تذکرہ ''جواہر زواہر'' میں لکھا ہے کہ شاہزادہ خرم (شاہجہان) اپنی بغاوت کے دوران میں نظام الدین کے پاس ٹھہرا تھا، جس سے جہانگیر نے انہیں جلاوطن کر دیا؛ ''علمای ہند'' میں ہے کہ اکبر نے ان کو دوبار جلاوطن کیا تھا۔

ان سب بیانات میں خسرو والی روایت ہی زیادہ صحیح اور مستند معلوم ہوتی ہے کیونکہ جیسا کہ تزک جہانگیری میں لکھا ہے کہ خسرو اپنی بغاوت کے دوران میں سکھوں کے پانچویں گورو ارجن دیو جی (۱۵۶۳ء-۱۶۰۶ء) کے وہاں ٹھہرا تھا اور اسی باعث جہانگیر نے ان کو ۳۰ مئی ۱۶۰۶ء کو قتل کروا دیا تھا۔

سے ناراض ہو گیا اور انہیں ہندوستان سے باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ یہ اسی زمانے میں بیت اللہ کے حج کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ اس کے بعد مدینہ منورہ میں روضۂ مبارک پر حاضری دی جہاں کئی سال رہنے کے بعد واپس اپنے آبائی وطن بلخ میں قیام فرمایا جہاں ہزاروں انسانوں کو ان سے فیض پہنچا۔ وہیں ۸ رجب ۱۰۳۶ھ[1] (۱۶۲۶ء-۲۷ء) کو بلخ میں انتقال فرمایا۔ ان کا مزار مبارک بلخ میں مرجع خلائق ہے۔

ان کے ہمعصروں میں شیخ نظام الدین نارنولی کا نام خاص طور پر لیا جاتا ہے۔ دونوں اکثر آپس میں ملتے رہتے تھے۔ کثیر الاولاد تھے، جن میں سے دو بیٹوں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

ان کے ایک بیٹے کا نام محمد سعید تھا، جو اپنے آبائی وطن تھانیسر لوٹ گئے تھے۔ دوسرے بیٹے کا نام شیخ عبدالحق تھا جو کرنال میں بس گئے تھے۔

ان کے خلفاً نہ صرف ہندوستان، بلکہ ہندوستان سے باہر افغانستان، توران، سعودی عربیہ اور وسط ایشیا میں بھی پھیلے ہوئے تھے۔ ویسے تو ان کے خلفاً کی فہرست بہت طویل ہے، لیکن یہاں جگہ کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے چند نام دیے جاتے ہیں۔

شیخ ابوسعید گنگوہی، شیخ حسین بہوری، شیخ پائندہ بنور، میر سید اللہ بخش، شیخ عبدالکریم لاہوری، شیخ دوست، محمد صوفی لاہوری، شیخ مصطفیٰ، شیخ عبدالفتح، شیخ عبدالرحمٰن کشمیری، سید قاسم برہانپوری، شیخ صادق برہان پوری، قاضی عبدالحئی ولد قاضی سلیم کیرانی، شیخ فتح۔

تصانیف:

۱۔ بحر التصوف: یہ رسالہ سوانح تالیف امام احمد بن محمد الغزالی الطوسی (م:۵۱۸ھ/۱۱۲۳ء) کی نہایت قابل قدر شرح ہے۔ اس میں مسائل سلوک و تصوف، بالخصوص مقامات عشق کا بیان ہے۔ کتاب کو ۶۸ فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں ہے۔

۲۔ شیخ نظام الدین تھانیسری[1] (رحمۃ اللہ) نے قرآن مجید کے مختلف حصوں کی تفسیریں لکھی ہیں، ان کے نام تذکروں اور مخطوطات کی فہرستوں میں مختلف ہیں۔ مثلاً ریاض القدس، تفسیر نظامی، تفسیر

---

[1] دانش (ایک فارسی-اردو مجلہ) ۲۳:۶۹:۱۳-۲۰۱-۲۳۴: ۲۸ رجب ۱۰۳۵ھ

علمای ہند-۱۰۲۴ھ، ص:۵۲۵

جواہر زواہر-۱۰۲۴ھ "جامع فضل" مادہ تاریخ دیا ہے، ص:۴۵

علمائے ہند (اردو): ۵۲۵؛

سورہ فاتحہ، تفسیر پارہ ہفتم اور تفسیر دو پارہ اخیر قرآن۔

۳۔ رسالہ بلخیہ : رسالہ بلخی

''خزینۃ الاصفیا'' میں آیا ہے کہ ''رسالہ بلخی'' علمائے بلخ کے اعتراضات میں لکھا گیا تھا۔ اس کے قلمی نسخے کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔

۴۔ رسالہ حسانیہ:

اس کے مخطوطہ کا کہیں ذکر نہیں ملتا ہے۔ (دانش: ۲۳: ۶۹-۱۳ص: ۲۱۳)

جواہر زواہر (ص: ۴۷) میں اس کا نام ''رسالہ احسانیہ'' لکھا ہے۔ اس کے مطابق یہ ۱۰۳۶ھ سے پہلے کی تصنیف ہے اور ۱۱۱۲ھ سے پہلے اس کی کتابت ہوئی۔ یہ رسالہ وحدت الوجود کے مسئلے پر ہے اور ۳ اوراق پر مشتمل ہے۔

۵۔ رسالہ حقیقت - رسالہ حقیقہ:

اس رسالہ کے بھی کئی نام ملتے ہیں۔ جیسے رسالہ حقیقت، رسالہ حقیقہ در بیان ہفت بطن وجود اور رسالہ در تصوف۔ اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور می اور دوسرا کتابخانہ گنج بخش اسلام آباد میں تفسیر سورہ فاتح والے مجموعہ میں نمبر ۹ پر محفوظ ہے۔

۶۔ رسالہ در اسرار الٰہیہ:

اس رسالے میں نہایت دلچسپ پیرائے میں سالکان طریقت کی تربیت معنوی کا سامان میسر ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں ہے۔ اس کی کتابت ۱۱۴۳ھ میں ہوئی تھی۔

۷۔ رسالہ وحدت:

اس رسالے کے بارے میں کچھ نہیں ملتا

۸۔ رویت خدا:

اور رسالوں کی طرح اس میں بھی نثر و نظم کی آمیزش ہے۔

۹۔ شرح ابیات

۱۰۔ شرح ایاکم والامردان

۱۱۔ شرح لمعات مکی و مدنی

روایت ہے کہ شیخ نظام الدین تھانیسری جب مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کے لئے گئے تو "لمعات" کی شرحیں لکھیں ایک مکہ میں اور دوسری مدینہ میں۔ پہلی کا نام شرح مکی اور دوسری کا نام مدینہ منورہ رکھا۔ حضرت رسالت پناہؐ کی روحانیت تشریف لا کر ان کو "لمعات" تعلیم کرتی تھی اور اس کے اسرار و رموز کی وضاحت کرتی تھی چنانچہ انہوں نے آنحضرت کے بیان کردہ حقائق و معارف جمع کر کے دو کتابیں تالیف فرمائیں، لمعات میں ایک سطر ایسی بھی تھی جس کی طرف رسول اکرمؐ نے بطور خاص اشارہ فرمایا اور شیخ نظام الدین نے اس کے گرد آب زر سے حلقہ لگا دیا۔ وہ کتاب آج تک ان کے خاندان میں موجود ہے۔

نظام الدین احمد گاہ گاہی شعر بھی کہتے تھے۔ ملاحظہ ہو ان کے اشعار کے کچھ نمونے۔

بخت بد جز بقصہ رہبر نیست
جنگ با بخت بد میسر نیست
نیست گر زاہدم وگر رندم
علیم الاہمیں کہ از بندم

باوجود اس کے کہ نظام الدین تھانیسری عرفان اور افکار اسلامی میں نہایت اعلیٰ اور ارفع مقام و مرتبہ پر فائز تھے، ساری زندگی گوشہ گمنامی میں بسر کر دی۔

شیخ نعمت اللہ فیروز پور جھرکہ

سید نعمت اللہ بن عطا اللہ کا لقب جلال الدین تھا۔ یہ نارنولی فیروز پوری قادری سلسلے کے مشہور بزرگ تھے۔ یہ نارنول میں پیدا ہوئے اور وہیں پر پرورش پائی۔ بڑے ہو کر حصول علم کے لئے دور دراز شہروں کا سفر کیا۔ جونپور میں شیخ محمد افضل عثمانی جونپوری سے علم ہیئت پڑھا۔ پھر نکاح کر کے فیروز پور جھرکہ ہی میں مقیم ہو گئے۔

فیروز پور جھرکہ میں سیف خاں نے انہیں چار سو ایکڑ زمیں عطا کی۔ شاہزادہ شجاع (

۱۶۱۶-۱۶۶۰ء) جب بنگال کا حاکم بنا تو ان کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوگیا۔ شاہزادہ کی بیعت اور خود اپنے زہد وتقویٰ کے باعث لوگوں میں انہیں بے حد مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی ۔ جب اورنگزیب ، شجاع کو شکست دے کر برسر اقتدار پہنچا تو انہیں پانچ ہزار نقد ادا کئے۔

شیخ نعمت اللہ نے ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۱ء میں انتقال فرمایا۔

نورالدین ہانسوی

یہ قطب الدین منور ہانسوی کے فرزند تھے۔ جب سلطان محمد تغلق (۱۳۲۵-۱۳۵۱ء) نے شیخ قطب الدین کو طلب فرمایا تو نورالدین بھی والد کے پیچھے پیچھے چل پڑے ، مگر سلطان کے سلوک اور امراء سے اسقدر خوفزدہ ہوئے کہ بیہوش ہو گئے ۔ جب قطب الدین نے ان کی یہ حالت دیکھی تو فرمایا۔ "بابا نورالدین العظمۃ والا کبریا اللہ" جونہی یہ الفاظ نورالدین کے کان میں پڑے ، انہوں نے اپنے باطن میں طاقت کا احساس کیا۔

شیخ نورالدین نے فارسی زبان میں اسلام کے اوپر کئی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں[1]۔

ان کی قبر بھی آبائی قبرستان کے گنبد میں ہے۔

ولی محمد نارنولی

اپنے زمانے کے عالم و فاضل اشخاص میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے طریقت میں عبداللہ اکبرآبادی سے فیض حاصل کیا۔ مثنوی مولوی روم کی شرح لکھی تھی باوجود طریقت کے شریعت کے پابند تھے ۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے مطابق ، شیخ ولی محمد نارنولی کا امیر ابو العلاؒ قدس سرہ سے ایسا ہی تعلق تھا جیسا کہ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کو محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین قدس سرہما کے ساتھ تھا اور ان کا سلوک وعرفان شریعت محمدیہ کا اتباع اور سنت سنیہ کی پابندی ، قول و فعل میں بال برابر بھی ان سے انحراف برداشت سے باہر تھا۔

۱۵ شوال ۱۰۵۷ / نومبر ۱۶۴۷ کو اکبر آباد میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

---

[1] اسلام پر فارسی میں کئی کتابیں لکھیں ۔ ہریانہ کا اتہاس :۲:۱۹۴

حوالہ جات

شیخ ابوالفتح تھانیسری (ص-۵۳)

علمای ہند (ف)-۶؛ طبقات شاہجہانی

۲۳۰؛ نزہتہ الخواطر: ۲: ۱۱؛ منتخب التواریخ -۳: ۱۸۷

احمد ہانسوی (ص-۵۴)

نزہتہ الخواطر: ۲ :۱۴۳

شیخ امان اللہ پانی پتی (ص-۵۶)

گلزار ابراہیم (اردو) :۲۶۶؛ اخبار الاخیار :۲۴۷؛ علمائے ہند (فارسی) ۲۸، (اردو) ۱۲۰؛ سیر المتاخرین :۲۸۰؛ طبقات شاہجہانی: ۱۶۲؛ خزینتہ الاصفیاء: ۱: ۴۲۴

ابواد حصاری (ص-۵۷)

اسٹوری: ۱۱۸۵ (۴۳)

بالکرشن برہمن حصاری (ص-۵۷)

ایتھے :۹۰۷؛ ۹۴۰؛ ۱۰۵۶؛ ۱۲۹۸؛ ۱۳۱۶

قاضی ثناءاللہ عثمانی۔ پانی پتی (ص-۵۹)

علمای ہند: ۳۸ (فارسی)، ۱۴۲ (اردو)؛ کیٹلوگ آف پرشین پرنٹڈ بکس: ایشیاٹک سوسائیٹی ۱۹۶۷: ۱۵؛

نزہتہ الخوطر: ۷: ۱۱۳-۱۱۴

جلال حصاری (ص-۶۰)

مارشل: ۲۲۴؛ اسٹوری: ۷۳۵؛ ۷۳۷: ۱۴۱۲

دی شاہجہاں آف دلی: ۸۰، ۸۱، ۹۶، ۹۷، ۱۰۱

حضرت شیخ جلال تھانیسری (ص-۶۱)

سفینتہ اولیا: ۱۲۷؛ ایتھیے: ۳۱، ۳۳۷، ۶۵۴؛ ختم خانہ تصوف: ۳۵۷؛ علمای ہند: (فارسی): ۴۰؛ اخبار الاخیار: ۲۹۱؛ اکبرنامہ: ۳: ۳۶۱؛ سیر المتاخرین: ۱: ۲۷۳؛ اسٹوری: ۷۳۵، ۷۳۷، ۱۴۱۲؛ طبقات شاہجہانی: ۱۹۸؛ مارشل: ۲۲۳؛ منتخب التواریخ: ۳: ۵؛ گلزار ابرار: ۵۷۹؛ طبقات اکبری: ۳: ۴۷۳؛ نزہتہ الخواطر: ۴: ۷۳؛ خزینتہ الاصفیا: ۱: ۴۲۹

شیخ جنید حصاری (ص-۶۵)

اخبار الاخیار: ۲۸۸؛ خزینتہ الاصفیا: ۱: ۴۰۶؛ تذکرہ مشائخ ہند: ۱: ۱۵۵

شیخ حسن بن حسام نارنولی (ص-۶۵)

تذکرہ صوفیائے میوات: ۴۶۷۔ نزہتہ الخواطر: ۴: ۸۸

حمید الدین نارنولی (ص-۶۶)

علمای ہند (فارسی): ۵۴

حضرت شاہ محمد رمضان مہمی (ص-۶۶)

علمائے ہند (اردو): ۵۰۶؛ علمای ہند (فارسی): ۹: ۲۷۹؛

تذکرہ صوفیائے میوات: ۴۷۳

شیخ عبدالحق کرنالی (ص-۶۹)

تاریخ محمدی: ۱۴

شاہ عبدالحکیم مہمی (ص-۷۰)

پنجاب کے قدیم اردو شعراء: ۷۰

ملا عبدالرحمٰن اخوان زادہ نارنولی (ص-۷۱)

طبقات شاہجہانی: ۳۲۴

عبدالرحمٰن پانی پتی (ص-۷۱)

نزہۃ الخواطر: ۸: ۲۴۵؛ علمائے ہند (اردو): ۵۷۷

عبدالعزیز تھانیسری (ص-۷۲)

پنجاب انڈر سلطانز: ۱۷۳؛ دی دہلی سلطنت (موجمدار)

: ۵۲۸؛ تذکرہ صوفیاے میوات: ۲۹۰-۲۹۱

عبدالعزیز حصاری (ص-۷۳)

اسٹوری: ۱۸۳

عبدالکریم مشتاق جھجری (ص-۷۳)

رئیو: ۹۹۴

شیخ عبدالواسع ہانسوی (ص-۷۴)

تذکرہ شعرائے ہریانہ: ۱۲؛ رئیو: ۹۹۸، ۱۰۳۰،

۱۰۹۶؛ دستور الفصاحت: ۱-۲

شیخ عبدالوہاب کرنالی (ص-۷۵)

طبقات شاہجہانی: ۳۲۲

شیخ عزیز اللہ مہمی (ص-۷۶)

تاریخ محمدی: ۱۰

شیخ علی بن محمود پانی پتی (ص-۷۶)

نزہۃ الخواطر: ۵: ۲۸۴

عنایت خان راسخ پانی پتی (ص-۷۷)

رسالۂ ذکر مغنیان ہندوستان: ۴-۱۲

مولوی عماد علی سونی پتی (ص-۸۰)

تذکرہ بے بہا: ۲۲۴؛ مطلع انوار: ۳۷۶

غلام احمد بھکن صدیقی ہانسوی (ص-۸۱)

مارشل: ۵۰۱

غلام الحسنین پانی پتی (ص-۸۲)

مطلع انوار: ۳۸۸

غلام محمد خان جھجری (ص-۸۳)

اسٹوری: ۱۰۴۴

حافظ غلام مصطفیٰ تھانیسری (ص-۸۳)

اسٹوری: ۲۳ (۳۷)؛ ڈی۔این، مارشل: ۱۴۱؛

ہریانہ کا اتہاس: ۲۲۷

حضرت شاہ غلام نبی فیروز پور جھرکہ (ص-۸۵)

تذکرہ صوفیاے میوات: ۶۲۱، ۶۲۸

فخر الدین ہانسوی (ص-۸۶)

نزہۃ الخواطر: ۲: ۱۰۷؛ اخبار الاخیار: ۹۷؛

سیر العارفین: ۷؛ ۳۸]؛ علماے ہند (اردو): ۵۸۵

شیخ فرخ نارنولی (ص-۸۶)

تذکرہ صوفیائے میوات ۴۷۰؛ نزہۃ الخواطر: ۵: ۳۰۵

شیخ قطب الدین منور ہانسوی (ص-۸۷)

آئین اکبری: ۳: ۴۱۵؛ سیر المتاخرین: ۱: ۲۷۸؛

اخبار الاخیار: ۹۳-۹۵؛ نزہۃ الخواطر: ۲: ۱۱۳؛

ہریانہ کا اتہاس: ۲: ۱۹۴

منشی گوبند نراین صبا نارنولی (ص-۸۸)

خمخانۂ جاوید، ۵: ۲۵۸؛ تذکرہ شعرائے جیپور: ۳۰۳

شاہ لطف اللہ انبالوی (ص-۸۹)

علماے ہند (اردو): ۴۰۱؛ برکات اولیا: ۱۶۱، خزینۃ الاصفیا: ۱: ۴۵۸؛ نزہتہ الخواطر: ۶: ۲۴

محمد ابوالحسن فرید آبادی (ص-۹۰)

استوری: ۱۳۹۳، ۱۱۸۴ (۳۵)

شاہ محمد اسمٰعیل مہی (ص-۹۰)

تذکرہ صوفیائے میوات: ۵۰۰

محمد اکبر براسوی (ص-۹۲)

استوری: ۱۰۱۹ (۱۰۳۵)

محمد بن شیخ تھانیسری (ص-۹۳)

ریئو: ۲: ۴۹۳ الف؛ ۴۹۴ ب؛ ضمیمہ ـ ۶۸۳؛ ایتھے: ۲: ۱۲۳۲؛ ہسٹری: انڈ کلچر آف انڈین پیپل ۵۳۸

محمد علی انصاری پانی پتی (ص-۹۳)

رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان بہشت نشان: ۶

محمد بن محمود پانی پتی (ص-۹۴)

نزہتہ الخواطر: ۲: ۱۴۳

حاجی محمد سلطان تھانیسری (ص-۹۵)

علمای ہند (فارسی): ۸؛ طبقات شاہجہانی: ۲۲۸؛ ڈی باین، دمارشل: ۳۴۲؛ ریئو: ۱۰۷۸؛ منتخب التواریخ ۳: ۱۸؛ نزہتہ الخواطر: ۵: ۱۵۸-۵۹؛ طبقات اکبری: ۲: ۴۶۷

محمد صادق انبالوی (ص-۹۶)

ریئو: ۳۹۹؛ ایتھے: ۲۷۱-۲۷۲؛ ایشیاٹک سوسئٹی: ۲۷۸-۷۹ء؛ محمد اشرف کیٹلوگ: ۱۲۸؛ بانکی پور: ۲۱۰۵؛ ہریانہ کا اتہاس: ۲: ۲۳۷ (ہندی): ۱۹۸۱

مولوی نجف علی جھجری (ص-۹۷)

علماے ہند (اردو): ۵۱۵؛ قصر علم: ۹۱؛ نزہتہ الخواطر: ۷: ۴۹۵؛ ذکر غالب: ۱۷۶؛ تاریخ ادبیات ایران: ۵۰۵

نضام پانی پتی (ص-۱۰۰)

ریئو: ۳۵۸؛ مارشل: ۳۷۷؛ خزینۃ الاصفیا: ۴۵۵

نظام الدین تھانیسری (ص-۱۰۱)

ایتھے ـ ۱۹۳-۱۹۴؛ ۳۳۷، ۴۰۳؛ ۷۲۴: ۱۰۷۵؛ تذکرہ جواہر زواہر ۴۳، ۴۶، ۴۷؛ علمای ہند (فارسی): ۲۴۱ (اردو) ۵۲۵، ۵۹۶: مارشل: ۳۷۹-۳۸۰؛ اذکار ابرار: ۵۸۰؛ نزہتہ الخواطر: ۵: ۴۱۸؛ دانش ۲۳: ۱۳۶۹: ۲۰۱-۲۳۴

شیخ نعمت اللہ فیروز پور جھرکہ (ص-۱۰۶)

تذکرہ صوفیائے میوات: ۴۶۸

نورالدین ہانسوی (ص-۱۰۷)

اخبار الاخیار: ۹۵؛ نزہتہ الخواطر: ۲: ۱۷۶

ولی محمد نارنولی (ص-۱۰۸)

نزہتہ الخواطر: ۵: ۴۳۱؛ تذکرہ صوفیائے میوات: ۴۶۹

باب پنجم

اصفیاء

شیخ آدھو حصاری

یہ سہروردیہ چشت کے سلسلے کے پیرو تھے۔ ذکر و شغل، توکل و تسلیم، ہمت و ایثار، جملہ صفات ان کی ذات میں موجود تھیں۔ کہتے ہیں کہ دعوت و تسخیر کی بدولت ایک جن ان کی فرمانبرداری اور خدمت گذاری میں رہتا تھا، جو دو تین آدمیوں کا کام دو تین دن میں پورا کر دیتا تھا۔ لوگ جن کی محبت دیکھ کر تعجب کرتے تھے اور جن کو دیکھ کر شیخ کی ولایت کے قایل ہوتے تھے۔

دسویں صدی کے آخری نصف میں انہوں نے وفات پائی۔ ان کی خوابگاہ قلعہ حصار فیروزہ میں ہے۔

حصار نفس شکستن کمال فیروزی است۔

مولوی احمد اللہ پانی پتی

قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے فرزند اور شاگرد اور مرزا مظہر جان جاناں دہلوی (۱۶۹۸-۱۷۸۰ء) کے مرید تھے۔ فقہ و حدیث میں مہارت اور ورع اور تقویٰ میں کمال حاصل تھا۔ ۱۱۹۸ھ (۱۷۷۳ء) میں وفات پائی۔

شیخ احمد مجد شیبانی نارنولی

شیخ احمد مجد بڑے صاحبِ مقام اور جامع العلوم بزرگ ہوئے ہیں۔ انہیں شریعت اور طریقت، ورع اور تقویٰ، ذوق و حال میں بلند مقام حاصل تھا۔ امر و نہی میں ثابت قدم تھے اور اہل دنیا سے انہیں کوئی رغبت نہ تھی۔

ان کا مقام ولادت نارنول، منشا اجمیر اور مدفن ناگور تھا۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ احمد مجد بن مجد الدین بن قاضی تاج الافضل بن شمس الدین شیبانی، قاضی مجد الدین کے سات بیٹے تھے۔ سب کے سب دانشمند، متقی اور متدین۔ احمد مجد کو علم و عمل میں سب پر برتری حاصل تھی۔ طالبعلمی کے دوران دانشمندوں اور امراً و ملوک سے بحث و مباحثہ ہوتا رہتا تھا۔ یہ فارسی اور عربی میں فصیح تقریر کرتے تھے۔ ۱۸ سال کی عمر میں مختلف علوم میں درس دینے لگے تھے۔

جوانی میں جب خواجہ حسین ناگوری (م: ۹۰۱ھ/۱۴۹۵-۹۶ء) کے مرید ہوئے تو بحث و مباحثہ اور امراً و ملوک کے یہاں آمد و رفت سے توبہ کرلی۔ اپنے پیر و مرشد سے علم طریقت سیکھا۔ ۱۸ سال کی عمر میں نارنول کی سکونت ترک کر کے اجمیر چلے گئے اور ۷۰ سال تک وہاں رہے اور زہد و ورع و مختلف ریاضات میں عمر بسر کردی۔

جب ۹۲۲ھ/۱۵۱۴ء میں رانا سانگا نے اجمیر پر حملہ کیا اور اسے فتح کرلیا تو احمد مجد ۷۲ سال بعد (۹۰ سال کی عمر میں) نارنول واپس لوٹ آئے (اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ احمد مجد تقریباً ۸۳۲ھ (۱۴۲۸ء) میں پیدا ہوئے ہونگے) انہوں نے ۲۵ صفر ۹۲۷ھ (۴ فروری ۱۵۲۱ء) کو ناگور میں وفات پائی۔ وہیں پر اپنے پیر کے قدموں میں ان کی خوابگاہ ابدی ہے۔

شاہ اعلیٰ چشتی پانی پتی

اپنے والد نظام الدین و نظام اولیا سے کسب فیض کیا۔ "سیر الاقتاب" کے مصنف الہ دیا نے ان کے ملفوظات کو تالیف کر کے "جوار الاعلیٰ" کے نام سے کتاب مرتب کی۔

ان کا اصلی نام عبدالسلام تھا۔ شاہ اعلیٰ خطاب حضرت نظام نارنولی نے عطا فرمایا تھا۔ قراخاں

کے یہاں نوکری کرتے تھے جو امرائے بابری میں سے تھے۔

انہوں نے ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء میں ولادت اور ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۳ء میں وفات پائی۔

اللہ دین مجذوب نارنولی

یہ نارنول کے رہنے والے تھے۔ اکثر بازاروں میں پھرا کرتے تھے۔ قبر بھی ان کی وہیں پر واقع ہے۔ عجیب وغریب حال میں رہتے تھے۔ وہ تارا بجاتے اور افغانی غزلیں گاتے تھے۔ انہوں نے ۵ شعبان ۹۴۰ھ (۱۹ فروری، ۱۵۳۳ء) کو وفات پائی۔

شیخ بدھنی کیتھلی

زاد بوم ان کا اودھ تھا۔ توکل کا یہ عالم تھا کہ خدا کے سوائے کسی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ یہ بدھنی کیوں کہلانے لگے، اس کے پیچھے بھی ایک روایت ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک بار خواجہ قطب الدین (م: ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ/۲۷ نومبر ۱۲۳۵ء) مع دیگر بندگان خدا کے سیر کو نکل پڑے۔ بھوک اور پیاس کی شدت سے ہر ایک کا برا حال ہو گیا۔ حضرت قطب الدین ہر ایک کو سونٹھ کی ایک گرم کاک دیتے اور صوفیؔ (شیخ بدھنی) اپنے شکستہ کوزے سے ہر ایک کو پانی پلاتے، اس دن سے خواجہ کو کاکی اور صوفی کو بدھنی کہنے لگے۔ شیخ بدھنی کی خوابگاہ کیتھل میں ہے۔

شیخ برہان الدین ہانسوی

یہ شیخ جمال الدین ہانسوی کے فرزند ارجمند تھے۔ صاحب حال وقال تھے۔ علم اس درجے کا تھا کہ مناظرہ اور برہان و حجت سے بھی گریز نہیں تھا۔

اپنے والد جمال الدین کی رحلت کے وقت برہان الدین بہت چھوٹی عمر کے تھے۔ چنانچہ ان کو شیخ فرید گنج شکر کی صحبت میں بھیج دیا گیا۔ انہوں نے نہایت لطف اور عنایت کے ساتھ خلافت نامہ، مصلا اور عصا عطا فرمایا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ جب تک وہ بقید

حیات رہے، کسی اور کے مرید نہ ہوئے۔

ان کا ایک بھائی بھی تھا۔ جو دیوانہ ہوگیا تھا۔

شیخ بہاء الدین جیندی

کسی زمانے میں جیند سرہند کے تحت تھا۔ شیخ بہاء الدین (وفات - ۱۶-۱۵۱۵ء/۹۲۱ھ) یہیں کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے شیخ احمد تقی مکی کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد سرہند کے گورنر کی درخواست پر آپ سرہند چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی۔ آپ قادریہ وشطاریہ سلسلے سے وابستہ تھے۔

سید تاج الدین شیر سوار نارنولی

یہ شیخ قطب الدین منور ہانسوی کے مرید باصفا تھے۔ ایک طرح سے ان کا سلسلہ شیخ المشائخ تک پہنچتا ہے۔ وہ نارنول میں پیدا ہوئے اور وہاں کے پہاڑوں میں انہوں نے اس حد تک ریاضت شاقہ برداشت کی کہ وہاں کے دام و دد اور طیور کو ان سے بیحد انس ہوگیا۔ جب کبھی اپنے پیر و مرشد کی زیارت کو ہانسی جانا ہوتا، جنگل سے ایک شیر سواری کے لئے اور سانپ چابک کے لئے پکڑ لیتے۔ جب ہانسی کے قریب پہنچتے، شیر اور سانپ کو جنگل میں چھوڑ دیتے اور اپنے مرشد کی خدمت میں پیدل چل کر حاضر ہوتے۔ ایک دن استغراق کی حالت میں شیر پر سوار، ہاتھ میں سانپ لئے، پیر و مرشد کے سامنے جا پہنچے۔ جب قطب الدین ہانسوی کی نظر ان پر پڑی، تو بولے: ''اے سید! حیوان میں تو پھر بھی جان ہوتی ہے، اگر بندہ خدا دیوار کو بھی حکم دیں تو جنبش میں آجائے'' اتنا کہنا تھا کہ دیوار، جس پر قطب الدین بیٹھے تھے، ہلنے لگی۔ انہوں نے دیوار سے مخاطب ہوکر کہا۔

''میں تو صرف مثال دے رہا تھا، تو ہل مت''

سید تاج الدین شیر سوار نے امیر تیمور گورگان (۷۷۰-۸۰۷ھ/۱۳۶۸-۱۴۰۴) کے عہد میں ۸۰۲ھ[1] (۱۳۹۹ء) میں نارنول میں وفات پائی۔ ان کی قبر وہیں ہے۔

---

[1] تذکرہ مشائخ ہند (۱۵۱:۱) میں ان کی وفات ۷۸۴ھ (۱۳۸۲ء) دی ہوئی ہے۔

حضرت شیخ جلال الدین[1] محمد کبیر الاولیا پانی پتی

ان کا اصلی نام خواجہ محمد تھا، لیکن اپنے پیرو مرشد حضرت شرف الدین کے عطا کردہ لقب ''جلال الدین'' سے مشہور ہوئے ۔ ان کے والد گرامی کا نام شیخ محمد تھا۔ وہ پانی پت کے امرائیں سے تھے۔

جلال الدین پانی پت ہی میں پیدا ہوئے۔ ان کا نسب نامہ والد کی طرف سے خلیفہ ثالث حضرت عثمان ذی النورینؓ (م: ۱۳ ذی الحجہ ۲۶/۲۵ھ/۳۰ ستمبر ۶۴۵-۶۴۶ء) پر مبنی ہوتا ہے۔ ان کو حسن باطنی کے علاوہ حسن ظاہری بھی عطا ہوا تھا۔ ایام طفولیت ہی سے ان میں آثار بزرگی نمایاں تھے۔ بچپن ہی میں یہ عشق الٰہی کے اسیر ہو گئے۔ اکثر یہ ہوتا کہ جنگل میں تشریف لے جاتے اور وہاں ذکر و فکر میں مشغول رہتے۔

حضرت شرف الدین قلندر انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان کے بچپن ہی میں وہ انہیں دیکھنے ان کے گھر پر آیا کرتے تھے۔

سیر و سیاحت سے مراجعت کے بعد یہ حضرت شمس الدین ترک پانی پتی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔ وہ دراصل بو علی قلندر سے بیعت ہونا چاہتے تھے، لیکن جب انہوں نے حضرت قلندر سے درخواست کی تو انہوں نے فرمایا:

''جلدی نہ کرو، تمہارے پیر آنے ہی والے ہیں۔''

حضرت ترک نے ایک دن ان کو گھوڑے پر سوار دیکھا تو حاضرین سے کہا:

''اپنی نعمت اس لڑکے میں دیکھتا ہوں''

شیخ جلال گھوڑے سے اترے اور ان کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ حضرت ترک نے اسی وقت ان کو بیعت سے مشرف فرمایا اور کلاہ چرمی ان کے سر پر رکھ دیا اور کہا،

''ترا این ہم دادم و آن ہم دادم''

(تجھے یہ بھی دیا اور وہ بھی دیا)

حضرت ترک نے آخری عمر میں ان کو خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا۔

سلطان فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱-۱۳۸۸ھ) کو جب معلوم ہوا کہ یہ قوت روحانی سے دلی آئے

---

[1] محمود: مشائخ ہند: ۱: ۱۵۲

اور ان کی صحبت کے لیے چند سال اپنی زندگی کے ان کو عطا فرمائے اور ان کی دعا سے وہ اچھے بھی ہو گئے، تو انہوں نے (تغلق نے) خوش ہو کر کہا۔

"زہے طالع من کہ در عہد ما چنین اولیأ عظام ہستند"

(خوش نصیب ہوں میں کہ میرے عہد میں ایسے اولیائے عظام ہیں)

سلطان فیروز شاہ ان کی قدمبوسی کے لئے پانی پت گئے اور گلہائے عقیدت پیش کئے۔ انہوں نے اس نذرانے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

شیخ جلال نے اپنے پیر و مرشد کے حکم سے شادی کی۔ اولاد میں ان کے پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں۔ لڑکوں کے نام ہیں:

حضرت خواجہ عبدالقادر، خواجہ ابراہیم، خواجہ شبلی، خواجہ کریم الدین، خواجہ عبدالواحد۔

لڑکیوں کی شادی کرنال کے شیخ زادوں میں ہوئی تھی۔

شیخ جلال نے ۱۳ ربیع الاول ۷۶۵ھ (۲۰ دسمبر ۱۳۶۳ء) کو انتقال فرمایا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک سوستر (۱۷۰) سال سے زیادہ عمر پائی۔ مزار پانی پت میں زیارتگاہ عام و خاص ہے۔

شیخ جلال مادر زاد ولی تھے۔ سماع سنتے تھے شکار کا شوق تھا۔ لنگر ان کا عام اور وسیع تھا۔ ایک ہزار آدمی روزانہ ان کے ہاں کھانا کھاتے تھے۔ اعراس میں شریک ہوتے تھے۔ اور خود بھی عرس مناتے تھے۔

شیخ جمال الدین دہرسوی

شیخ حمزہ کے بیٹے تھے اور زاد و بوم ان کا دہرسو تھا، جو نارنول کے مضافات میں ہے۔ یہ اپنے والد کے مرید تھے اور انہی سے فیضیاب ہوئے۔ ان کی خواب گاہ دہرسو میں ہے۔

حضرت شیخ (نجم الحق) چاپن میواتی

شیخ چاپن، قصبہ سہنہ کے رہنے والے تھے جو دلی سے ۱۸ کوس کے فاصلہ پر میوات میں ایک قصبہ ہے۔ یہ فاضل اور صوفی اور شیخ عبدالعزیز دہلوی (۸۹۸-۹۸۵ھ/۱۴۸۴-۱۵۶۷ء) کے مشہور خلیفہ تھے، فقراء کے سجادہ نشین تھے، کتب تصوف مثلاً "فصوص الحکم" اور "نقد الفصوص" وغیرہ کا طالبوں کو درس

دیتے تھے۔ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کو آخری عمر میں ان سے بہت لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ بہت سی مہمات میں اس سے مدد چاہی تھی۔ محل شاہی کے قریب عبادت خانہ میں ایک جگہ ان کے لیے مقرر کر دی تھی۔ راتوں کو خلوت میں ان کے پاس حاضر ہوتا تھا۔ بادشاہ نے جب انہیں نماز معکوس پڑھتے ہوئے دیکھا تو اس کے خیالات بدل گئے۔ شیخ نے ۹۹۸ھ/۱۵۸۹-۹۰ء میں انتقال کیا۔

شیخ حسین انبالوی

برلاس قبیلے کے مراد ابنِ حیدر انبالوی کے بیٹے تھے، ان کے دادا نے ۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء میں ابنالہ کی سکونت اختیار کر لی۔ اس کے بعد یہ خاندان چند دن انبالہ میں مقیم رہا۔ بعد میں یہ لوگ نقل مکان کر کے سہسرام (بہار) چلے گئے۔ شیخ حسین ۹۸۰ھ (۱۵۷۲ء) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے سودھرہ اور تھانیسر کے مختلف اساتذہ سے تعلیم مکمل کی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ صاحب کشف و کرامات تھے۔ ۹ ذی الحجہ ۱۰۶۷ھ (۸ ستمبر ۱۶۵۷) کو لکھنؤ میں وفات پائی۔

شیخ سید حسین سونی پتی

سونی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کی زبان علم و فضل سے اور دل خدا طلبی کے شوق سے مالا مال تھا۔ رہنما اور پیر کی تلاش میں جنگلوں کی خاک چھانی۔ تقدیر الٰہی ان کو اجمیر شریف کی طرف کھینچ لے گئی۔ خود کو غریب نوازؒ کی خدمت سے مشرف کیا۔ خواجہ غالباً ان کے آنے کے منتظر ہی تھے۔ انہیں دیکھتے ہی فرمایا:

"میں حاضر ہوں۔ خدا نے تم کو میری فرزندی کے واسطے بھیجا ہے"

سید حسین نے اس بات کو تہ دل سے قبول کیا۔ خواجہ نے ان کو اپنا مرید بنا لیا اور اپنے ایک عزیز کی لڑکی کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا اور خرقہ خلافت دے کر سجادہ طریقت پر بیٹھایا۔

شیخ گدائی پانی پتی سے روایت ہے:

"خواجہ کا زمانہ عمر تھوڑے روز بعد پورا ہو گیا اور میرے پیران کے جانشین ہوئے"

شیخ حمزہ دھرسوی

شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا (۵۶۶-۶۶۶ھ/۱۱۸۸-۱۲۶۸ء) کی اولاد میں سے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب میر سید محمد گیسو دراز تک پہنچتا ہے۔ حمزہ دھرسوا ایک عظیم اور بابرکت پیر تھے۔ اور ان کا سارا وقت عبادت میں گزرتا تھا۔ انہوں نے طویل عمر پائی۔ سلطان بہلول (۱۴۵۱-۱۴۸۹ء) سے لے کر اسلام شاہ سور (۱۵۴۵-۱۵۵۴ء) کے عہد تک زندہ رہے۔

کبھی کسی حکمران کی ملازمت نہیں کی۔ کہتے ہیں کہ ایک رات ایک سرائے کی چوکیداری کر رہے تھے کہ ناگہاں خیال آیا کہ کسی ایسے آدمی کی خدمت کرنی چاہئے جو میرا محافظ بن سکے، نہ کہ میں کسی کا محافظ بنوں۔ بس خواجہ معین الدین چشتی کی زیارت کو اجمیر شریف پہنچے اور وہیں ان پر دیوانگی طاری ہو گئی۔ شیخ احمد مجد سے بھی فیض حاصل ہوا۔ بالآخر دھرسو میں جو نارنول سے تین کوس دور ایک قصبہ ہے، متوطن ہو گئے۔ دھرسو میں اقامت پذیر ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے بعض سادات نے شرافت کا دامن چھوڑ دیا تھا۔ حمزہ نے ان کی تربیت کی اور ان کو تعلیم دی۔ ان کے لئے ایک فارسی اور دوسرا عربی کا معلم مقرر کیا۔ حمزہ نے ۹۵۷ھ (۱۵۵۰) میں وفات پائی۔

حضرت میاں راج سوندھی

حضرت میاں راج شاہ ۱۲۱۶ھ (۱۷۹۹ء) میں پیدا ہوئے۔ والدین نے راج خان نام رکھا۔ بعد میں جب فقر و تصوف کے بلند مقام پر فائز ہوئے تو راج شاہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبدالسمیع یا سمیع خاں تھا۔

ان کا تعلق میو قوم کے قبیلے (پالی) ڈمنگل سے تھا۔ جو خاندان چندربنسی شری راجہ رام چندر سے جا ملتا ہے۔ اس قبیلے کا نکاس اجودھیا سے تھا۔ ان کے والد ہمیشہ ذکر اللہ میں محو رہتے تھے۔ پڑھنے لکھنے کے وسایل مفقود ہونے کے باعث ظاہری تعلیم سے تو بہرہ مند نہ ہو سکے لیکن عرفان و یقین سے پُر گھرانے میں آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی تھی اس لیے باطنی قوت اور نور ایمانی سے ہر دقیق مسئلہ کو حل فرما دیتے تھے۔ مدبر، مستغنی المزاج، متوکل باللہ، صاحب زہد و ورع، کمال منکسر المزاج، متصف بہ

صفات حسنہ بہ نمونہ سلف صالحین تھے۔ آخری عمر میں رات دن مشاہدہ جمال میں محو رہتے تھے۔ مریدوں کو توجہ قلبی سے طریقۂ اذکار و اشغال تلقین فرماتے۔ فارسی، اردو اور ہندی کے دوہے اور معرفت میں ڈوبے ہوئے اشعار پڑھتے۔

سائیں توکل شاہ نقشبندی انبالوی، حاجی امداد اللہ تھانوی، مولانا شاہ فضل الرحمٰن نقشبندی گنج مرادآبادی، حاجی سید وارث علی شاہ، مولانا غوث علی شاہ قلندری، حضرت شاہ ابوسعید نقشبندی مجددی دہلوی، مولوی میر محبوب علی میواتی ثم الدہلوی وغیرہ ان کے ہمعصر تھے۔

میاں راج شاہ نے مندرجہ ذیل بزرگوں سے فیض باطنی حاصل کیا:

میاں دین علی شاہ مجذوب دہلوی

میاں کلن شاہ مجذوب کوٹ پتلی

مولوی نور محمد کملی والے دہلوی

حضرت میاں اسمٰعیل کمہار، حصاری

میاں نور محمد نقاش

فیض باطنی حاصل کرنے کے بعد، پیر کامل کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل مہمی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے انہیں شرف بیعت بخشا اور دستار خلافت اپنے دست مبارک سے ان کے سر پر باندھی۔

خود میاں راج شاہ کے بہت سے خلفاً ہوئے ہیں جن میں مولانا عبداللہ شاہ، حاجی حیدر شاہ، غازی الدین حیدر شاہ (سہنہ)، حاجی سید عابد حسین دیوبندی اور میر محمد تقی تھانہ بھون وغیرہ مشہور تھے۔

۸ رمضان ۱۳۰۶ھ (۸ مئی، ۱۸۸۸ء) کو جام فنا نوش فرمایا۔

سکندر کیتھلی

شیخ سکندر، عماد الدین کیتھلی کے صاحبزادے تھے اور قادریہ سلسلے کے مشائخ میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے دادا شیخ کمال الدین کیتھلی بھی قادری سلسلے کے عماد میں سے تھے۔ ان کی وفات کے بعد خرقۂ خلافت سکندر کو ورثے میں ملا۔ ۱۰۲۳ھ/۱۶۱۴ء، میں وفات پائی۔

شیخ شبلی پانی پتی

شیخ شبلی بن شیخ جلال الدین چشتی صابری پانی پتی کا مقام بہت بلند تھااور مشائخ کبار میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تجرید اور تفرید میں یگانۂ روزگار تھے۔ دنیا اور اہل دنیا سے کوئی واسطہ نہ رکھتے تھے۔

''سیر الاقطاب'' میں آیا ہے کہ جسمانی عارضہ کی وجہ سے ان کے دونوں پاؤں بیکار تھے۔ اس کے باوجود وجد اور سماع میں کھڑے ہوکر وجد کرتے تھے۔ شیخ ادریس ان کے عزیز دوستوں میں سے تھے۔

۸۵۲ھ (۱۴۴۸ء) میں وفات پائی۔

حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی

شمس الدین ترک ملقب بہ شمس الاولیا کے والد کا نام سید احمد تھا۔ ان کے آبا واجداد ترکستان الاصل تھے اور یہ بھی ترکستان میں پیدا ہوئے تھے۔ اور وہیں ان کی تربیت ہوئی۔ ان کا سلسلہ نسب چند واسطوں سے حضرت محمد حنفیہ (۸۰-۱۵۰ھ/۶۹۹-۷۶۷ء) بن حضرت علی کرم اللہ وجہ تک پہنچتا ہے۔ ان کا لقب مشکل کشا تھا۔ انہوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، ریاضی، منطق، اور ہندسہ میں قابلیت حاصل کی، لیکن جلد ہی علوم معقول ومنقول سے فارغ ہوکر علم باطنی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

تلاش حق نے انہیں ترکستان ترک کرنے پر مجبور کیا۔ یہ وہاں سے چل کر ماوراء النہر ہوتے ہوئے ملتان پہنچے اور ملتان سے اجودھن آئے۔ وہاں حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کی خدمت بابرکت میں رہ کر فیوض اور برکات باطنی حاصل کئے۔ شیخ گنج شکر نے ان کو خلافت سے سرفراز فرمایا اور ان کو اطلاع دی کہ ان کا حصہ دوسرے مرشد کے پاس ہے اور انہیں حضرت علاء الدین احمد صابر کی خدمت میں کلیر روانہ کردیا۔ حضرت احمد صابر نے خواجہ شمس الدین کو دیکھ کر فرمایا۔

''ای شمس الدین! تو میرا فرزند ہے۔ میں نے خدا سے درخواست کی تھی کہ میرا سلسلہ تجھ سے جاری ہو اور قیامت تک جاری رہے۔''

انہوں نے شمس الدین کو بیعت سے سرفراز فرمایا، کلاہ چہار گوشیہ ان کے سر پر رکھی اور مقراض سر پر گھمائی، خواجہ شمس الدین نے گیارہ سال تک اپنے پیر ومرشد کو وضو کرانے کی خدمت سرانجام دی۔

مرشد نے پانی پت کی ولایت ان کے سپرد کرتے ہوئے ہدایت دی کہ پانی پت میں مستقل سکونت اختیار کرلیں۔ اپنے پیر و مرشد کے وفات کے تین دن بعد شمس الدین پانی پت کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب یہ پانی پت پہنچے تو شاہ ولایت شیخ شرف الدین بوعلی قلندر جو پانی پت میں مقیم تھے۔ وہاں سے ترک سکونت کر کے بوڑھا کھیڑا چلے گئے۔

اپنے پیر و مرشد سے جدا ہو کر شمس الدین، بلبن (۱۲۶۶-۱۲۸۷) کے لشکر میں ملازم ہو گئے۔ ریاضت، عبادت اور مجاہدت کے ساتھ آپ اپنے فرائض بھی بحسن و خوبی انجام دیتے رہے۔ اگرچہ ہر طرح کی سہولتیں مہیا تھیں اور امارت و اعزاز مین کسی طرح کی کمی نہیں تھی۔ اس کے باوجود ان کی زندگی فقر و فاقہ سے بسر ہوئی۔

رفتہ رفتہ ان سے کرامات کا اظہار ہوا، بلبن اور اہل لشکر ان کے حال سے خبر دار ہو گئے، تو وہ ملازمت سے مستعفی ہو کر کلیر چلے گئے۔

ان کی شادی ترکستان سے روانہ ہونے سے پہلے ہی ہو گئی تھی۔ ان کے ایک صاحبزادے سید احمد کا پتا چلتا ہے۔

۱۵ جمادی الثانیہ ۷۱۶ھ (۴ ستمبر ۱۳۱۶ء) کو اس جہان فانی سے کوچ فرمایا۔ پانی پت میں مدفون ہیں۔

خواجہ شمس الدین صاحب عظمت و ولایت تھے۔ علم ظاہری اور باطنی میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان کا زہد اور تقوی مشہور تھا۔ ترک اور تجرید، ریاضت، مجاہدۃ اور عبادت میں بینظیر تھے۔ وضع قطع سے قلندر معلوم ہوتے تھے اور قلندروں کا چرمی لباس بھی پہنتے تھے۔ ان کے پیر و مرشد حضرت مخدوم صابرؒ کلیری نے ان کے متعلق فرمایا تھا:

''شمس ما در اولیا چون شمس است''

قاضی شمس الدین شیبانی نارنولی

قاضی شمس الدین شیبانی، تغلق شاہ کے زمانے میں دلی سے نقل مکان کر کے نارنول میں مقیم ہو گئے۔ بڑے عالم اور فاضل انسان تھے۔ ابھی نکاح بھی نہیں ہوا تھا کہ زیارت کعبہ کا قصد کیا اور گجرات پہنچے۔ وہاں ایک مسجد میں دیکھا کہ ایک تفرقہ انگیز واعظ منبر پر آیا اور تقریر شروع کی اور کہا۔ یہ میرا ہاتھ

ہے ، اگر اسے کھولتا ہوں تو میں کھولتا ہوں اور اگر بند کرتا ہوں تو میں بند کرتا ہوں ۔ حاضرین میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ صدائے اعتراض بلند کرے ۔ لیکن قاضی شمس الدین نے فوراً کہا ۔ اگر تمہارے ہاتھ میں اتنی ہی طاقت ہے تو اپنے ہاتھ کو اپنی پشت پر کیوں نہیں باندھتے ۔ حاکم گجرات ان کی اس جرأت سے بہت خوش ہوا ۔ اپنی خوشنودی کے اظہار کے لئے اس نے انہیں سفر کے لئے ایک کشتی بھی عطا کی ۔

ان کے پانچ بیٹے تھے ۔ ان سب کو بھی بارگاہ ایزدی سے علم وفضل کی برکت عطا ہوئی تھی ۔ قاضی مجد بھی ان کے بیٹوں میں سے ایک تھے ، انہیں کے بیٹے شیخ احمد مشہور ومعروف ہیں ۔

شیخ شہاب الدین خطیب ہانسوی

حضرت شیخ نظام الدین اولیا نے فرمایا تھا کہ شیخ شہاب الدین خطیب ہانسوی ہر دلعزیز تھے ۔ ہر رات خطیب سورہ بقرہ پڑھتے تھے ۔ وہ خدا سے دعا گو تھے کہ موت کے وقت میں ہوں اور خدا ہو ، نہ بیچ میں ملک الموت ہو اور نہ فرشتہ ۔ آخر ہوا بھی ویسا ہی ، جیسا وہ چاہتے تھے ۔

شیخ عاشق محمد نارنولی

شیخ نظام الدین نارنولی کی اولاد میں سے تھے اور ساتھ ہی صاحب سجادہ بھی تھے ۔ درویشوں کی مانند زندگی بسر کرتے تھے ۔ اوصاف حمیدہ سے آراستہ اور پیراستہ تھے ۔ توکل وقناعت ، علم وعمل میں اپنے والد سے بھی سبقت لے گئے تھے اور شہرت میں تو کئی منزلیں ان سے آگے تھے ۔

طاعت اور عبادت کے آثار ان کے چہرے پر نمایاں تھے ۔ جب صاحب سجادہ ہوئے تو اس دن کے بعد کسی کے دروازے پر نہیں گئے ۔ نیا دن نیا رزق کے پابند تھے ۔ جو کچھ ملتا اسی دن صرف کر دیتے اور دوسرے دن کی فکر نہیں کرتے تھے ۔

عبد السلام پانی پتی

مولانا عبدالسلام حنفی گنگوہی (م: ۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء) کے خاندان سے تھے۔ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ تعلیم اپنے والد نظام الدین سے پائی اور ان کے بعد درس و تدریس، رشد و ہدایت کو لازمۂ حیات بنالیا۔ ۱۰۲۳ھ/۱۶۱۴ء میں پانی پت میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

مولانا عبدالغفور لاری پانی پتی

رضی الدین ان کا لقب تھا۔ یہ حضرت مخدوم الانامی مولانا عبدالرحمان جامی (۸۱۷-۸۹۸ھ/۱۴۱۴-۱۴۹۲ء) کے شاگرد اور مریدوں میں سے تھے۔ صوری اور معنوی فضائل انہوں نے مولانا جامی کی خدمت اور ملازمت ہی میں رہ کر حاصل کیے۔ ان کا شمار علما و عرفا میں ہوتا ہے۔ ان کی بہت سی مشہور تصانیف ہیں۔ شرح ملا پر حاشیہ لکھا اور تحقیق کی۔ اس ضمن میں انہوں نے الفاظ و لغت کا بھی حل کیا۔

ان کو اپنے پیر سے کمال کی عقیدت تھی اور ان کے پیر کو بھی ان پر بیحد ناز تھا۔ پیر کے وصال کے وقت یہ ان کی خدمت میں موجود تھے۔ حضرت مولانا نے ان کے حق میں فرمایا تھا:

''ایک کامل مرید کے ہوتے ہوئے دائرہ مریدین میں توسیع چنداں ضروری نہیں''

ان کی وفات طلوع آفتاب کے بعد بروز اتوار[1] ۵ شعبان ۹۱۲ھ (۲۱ دسمبر ۱۵۰۴ء) کو ہوئی۔ ان کا مزار بھی خیابان ہرات میں واقع ہے اور اپنے شیخ کی آرام گاہ کے متصل ابدی نیند میں سوئے ہوئے ہیں۔

قاضی عبد القادر پانی پتی

مولانا محمد پانی پتی شیخ الحینی کے بیٹے تھے۔ یہ پانی پت میں پیدا ہوئے تھے۔ اور وہیں پر نشوونما پائی۔ انہوں نے اپنے خاندان کے عالم شیخ عبدالغفور کی شاگردی اختیار کی اور فقہ اور تصوف میں

---

[1] ۵ شعبان ۹۱۲ھ کو اتوار نہیں، پیر تھا۔

مشہور ہوئے۔ حج سے واپسی پر اپنے چچا کے پاس اجین چلے گئے جو وہاں عہدہ قضاوت پر فائز تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ خود وہاں کے قاضی ہو گئے۔ قرآن کے علم وتفسیر میں خاص طور پر مہارت رکھتے تھے۔ اور اس بات کا اعتراف ان کے معاصرین نے بھی کیا ہے۔ ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۲ء) میں اجّین میں وفات پائی۔

شیخ عبدالکبیر بالا پیر پانی پتی

شیخ عبدالکبیر کے والد محترم اور خلیفہ حضرت شیخ عبدالقدوس (وفات: ۹۴۵/۱۵۳۸ء) تھے سخاوت وشجاعت خوارق وکرامات، وجد وذوق، سماع وشوق میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ سلطان سکندر بہلول (۱۴۵۹-۱۵۱۶ء) کو کرامات دکھائی اور ان کی من پسند غذا پیش کی۔

۹۴۷ (۱۵۴۰) میں وفات پائی۔

شیخ عثمان زندہ پیر پانی پتی

حضرت شیخ عبدالکبیر کے فرزند ارجمند، خلیفہ ارشد اور ان کے جانشین و سجادہ نشین تھے۔ صاحب کشف وکرامات علوم ظاہری و باطنی میں کامل تھے۔ ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) مین وفات پائی۔ گنبد کلاں میں مدفون ہیں۔

شیخ نظام پانی پتی ان کے صاحب زادے تھے۔

عزیز الدین خان پلولی

عزیز الدین خان پلول کے باشندے تھے۔ جو دلی کے مضافات میں ہے۔ ان کے والد کا نام سعدالدین خان تھا۔ عزیز الدین خان حنفی المذہب اور شاہجہاں آباد کے مفتی تھے۔ ۱۱۴۸ہجری (۱۷۳۵ء) میں وفات پائی۔

سید عطاء اللہ نارنولی

ان کا سلسلہ نسب اس طرح سے ہے۔ سید عطا اللہ بن سید حسین معروف بہ رسول نما بن جوہرالحسینی۔ یہ اور میر ہاشم نارنولی آپس میں حقیقی بھائی تھے۔ عطا اللہ اصل میں نارنول کے رہنے والے تھے، لیکن بعد کو دلی میں متوطن ہو گئے تھے۔ ان کا شمار اپنے وقت کے مشہور اصفیا اور مشائخ میں ہوتا تھا۔

مخدوم مولانا عماد الدین غوری نارنولی

ان کے آبا واجداد عرب سے ایران آئے اور پھر محمد غوری (م: ۱۵مارچ، ۱۲۰۶) کے ساتھ غور سے ہندوستان پہنچے۔

پڑھنے لکھنے سے شروع سے کنارہ کشی کرلی تھی۔ اپنا سارا وقت پہلوانی اور کشتی میں صرف کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب اپنے سے زیادہ طاقت والے پہلوان کو پچھاڑ دیا تو بڑی مستی اور غرور سے گھر کی طرف چلے۔ ایک مشہور عالم نے ان کی جب یہ حالت دیکھی تو ان کو طعنہ کیا، جس پر نہ صرف عماد الدین کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، بلکہ اپنے کیے پر پشیمان بھی ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے پڑھنے لکھنے کی بہت کوشش کی، لیکن سب بے سود، مجبوراً شیخ محمد ترک نارنولی کے روضے میں ملازمت اختیار کرلی اور رات دن وہیں رہنے لگے۔

روایت ہے کہ ایک رات کسی نے ان کو پیچھے سے پکڑا اور کہا:

''مانگ کیا مانگتا ہے۔''

انہوں نے علم تقویٰ کی درخواست کی اس نے کہا:

''اپنے بزرگوں کے کتبخانے سے استفادہ کر اور لوگوں کو درس دے''

اس دن سے علوم دینیہ کے دروازے ان پر کھل گئے۔

شیخ احمد مجد شیبانی ان کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

''مولانا عماد بہت بڑے انسان تھے اور ان کے بہت پیرو تھے۔ سید المرسلین ﷺ کی کسی بھی سنت کو کبھی ترک نہیں کرتے تھے۔''

یہ مولانا عماد الدین اُن مولانا عماد کی اولاد میں سے ہیں جو محمد تغلق کے زمانے (۱۳۲۵-۱۳۵۱ء) میں گذرے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حکومت کے نشے اور غرور میں محمد تغلق نے کہا تھا:

''جب فیض خدا کو زوال نہیں، تو نبوت خدا کو زوال کیوں ہو؟''

مولانا عماد نے فوراً کہا:

''گہہ مت کھاؤ'' اس پر سلطان نے ان کو قتل کروادیا تھا۔

غربتی حصاری

عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ ایک بار شیخ خوارزمی کے ہاں، جو اپنے وقت کے مشہور و معروف درویش تھے، محفل چل رہی تھی۔ قوالی گائی جارہی تھی۔ آخری شعر کا غربتی پر ایسا اثر ہوا کہ اس پر وجد طاری ہوگیا۔ شیخ حسین خوارزمی بھی ان کے ساتھ رقص کرنے لگے۔

۹۶۶ھ (۱۵۵۸ء) میں آگرہ میں وفات پائی۔

حضرت سید غوث علی شاہ پانی پتی

ابوالحسن خورشید علی نام تھا۔ رمضان کے مہینے میں جمادی الاول ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۶ء کو مبنع استھوان (بہار) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سید احمد علی تھا۔ سلسلہ نسب ۱۸ پشتوں کے بعد حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے مل جاتا ہے۔

ان کی تعلیم و تربیت دلی میں ہوئی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی، حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق، مولوی فضل امام خیرآبادی، مولوی قلندر علی جلال آبادی سے حدیث، فقہ، منطق، دینیات وغیرہ کی کتابیں پڑھیں اور دیگر علوم ظاہری و باطنی میں دستگاہ حاصل کی۔

سب سے پہلے اپنے والد ماجد سید احمد علی سے بیعت ہوئے اور حضرت لعل شاہ کے روحانی فیوض سے بھی فیض حاصل کیا جو حضرت سید فدا حسین رسول شاہی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ خاندان قادریہ میں یہ اعظم علی شاہ اور خاندان چشتیہ میں حضرت امیر الدین کے مرید اور خلیفہ تھے۔

انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام پانی پت میں گذارے حضرت بوعلی قلندر کے مزار کے

قریب ایک حجرے میں رہا کرتے تھے۔

۲۶ ربیع الاول ، ۱۲۹۷ھ/۹ مارچ، ۱۸۷۹ کو بعمر ۸۷ برس اس دار فانی سے کوچ فرمایا۔ ان کا مزار پانی پات میں واقع ہے۔

محمد یوسف ان کے سجادہ نشین اور مولوی گل حسن ان کے خلفا میں سے تھے۔

شیخ فرخ شاہ نارنولی

یہ شیخ نظام نارنولی کے بیٹے تھے۔ علم و دانش سے بہرہ اہل فنا و نیستی کی تمام خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ بڑے استقلال اور استواری سے اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر عمر بسر کر دی۔ جہانگیر پادشاہ (۱۶۰۵ء-۱۶۲۷ء) کے زمانے میں وفات پائی۔

شیخ فیض اللہ نارنولی

ترک دینا اور گوشہ نشینی سے پہلے شیخ فیض اللہ نارنولی کا ذریعہ معاش حمالی تھا۔ وہ شیخ نظام نارنولی (م: ۹۹۷ھ/۱۵۸۸ء) کے مرید ہو گئے اور خدا سے لو لگالی۔ اس کے بعد انھوں نے ریاضات اور مجاہدت کی بہت سی منزلیں طے کیں۔

اسی اثنا میں وہ ایک عورت پر عاشق ہو گئے کہ ننگ و ناموس کی تمام حدوں کو پار کر کے ڈھپ اور ڈھولکی ہاتھ میں لیے اس کیساتھ گھومتے رہتے تھے۔ غرضیکہ سر سے پانوں تک اس کے عشق میں غرق ہو چکے تھے۔

ایک روز اسی عالم میں اپنے پیر کے سامنے چلے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو خود بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں آ گئے اور کس کے رو برو اور کس حال میں ہیں۔ شیخ نظام ان کی یہ حالت دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ انھوں نے فیض اللہ کو لتاڑتے ہوئے کہا ''فیض اللہ! تم دور چلے گئے ہو اور دیر کر دی اور بھول گئے۔ لوٹ آؤ ہماری یاد اب تم کو تمہارے اوپر نہیں رہنے دے گی'' یہ سننا تھا کہ اپنی اصلی حالت کو لوٹ آئے اور پیر و مرشد کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ راہ عشق کو ترک کر اپنے صحیح راستے پر آ گئے اور بمرتبہ کمال پہنچے۔ یہی شیخ فیض اللہ کنچن کے نام سے مشہور ہوئے۔ انھوں نے ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء میں بادشاہ اکبر کے عہد مین وفات پائی۔

قطب الدین ہانسوی

علم وفضل کے علاوہ زہد وورع کے لیے بھی مشہور تھے۔ عرصہ دراز تک شیخ عبداللطیف برہان پوری کی خدمت میں رہے اور ان سے استفادہ کیا۔ اورنگ زیب ان سے بہت متاثر تھا۔ جب وہ تخت پر بیٹھا (۱۶۵۸ء) تو اس نے شیخ قطب الدین کو چار لاکھ درہم عنایت کیے۔ شیخ قطب الدین نے ان سے ایک گانوں بسایا اور اس کا نام قطب آباد رکھا۔ وہیں ۱۰۸۶ھ (۱۶۷۵) میں وفات پائی۔

حضرت شاہ کمال کیتھلی

ان کا نام کمال اور ''سلب الاحوال'' اور ''لال ریال'' ان کے القاب تھے۔ ان کے والد کا نام سید محمد عمر تھا جو بغداد کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ کمال انہی کے ہاں شوال ۸۳۵ھ (جنوری رفروری ۱۴۳۱ء) میں پیدا ہوئے۔ شاہ کمال حافظ قرآن اور عالم دین کے علاوہ ایک قابل طبیب بھی تھے۔

حضرت فیصل قادری نے ان کی والدہ کو ہدایت کی تھی کہ کمال کی تربیت صحیح طور پر کی جائے، کیونکہ ان کے قول کے مطابق یہ اولیا کے زمرے میں مراتب عالیہ پر فائز ہونے والے تھے۔ اس پر ان کی والدہ نے تعلیم وتربیت کے لیے ان کو فیصل قادری ہی کے سپرد کر دیا۔ فیصل قادری کے زیر تربیت یہ بہت جلد علوم ظاہری کی تکمیل وتحصیل سے فارغ ہو گئے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے حضرت فیصل ہی کے ہاتھوں دست حق پرست پر بیعت کر لی اور ان سے خرقہ خلافت پایا۔ انھوں نے سلوک کے تمام مدارج طے کیے۔ ریاضت عبادت اور مجاہدہ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ان کے پیرومرشد نے ان کے روحانی کمالات سے خوش ہو کر ان کو ہندوستان کی ولایت عطا فرمائی اور ان کو ہدایت ہوئی کہ ہندوستان جا کر تا دم آخر لوگوں کی رشد و رہنمائی میں مشغول رہیں۔

اس کے بعد انھوں نے عراق، ایران، اور مشہد میں نجف اشرف، تبریز اور اصفہان کی سیر کی

اور وہاں کے درویشوں سے ملے۔

ہندوستان میں سب سے پہلے ٹھٹھ پہنچے۔ وہاں ایک سال تک قیام کیا۔ ٹھٹھ میں ملا سید محمد کی بیعت کی اور ان سے بھی خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ ٹھٹھ سے ملتان، ملتان سے لدھیانہ اور وہاں سے پائل (سرہند کے قریب) تشریف لے گئے۔ پائل سے کیتھل چلے گئے اور اس ہی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ کیتھل میں مفتیوں کا اقتدار تھا۔ ان کی پانچ سو پالکیاں نکلا کرتی تھیں۔ کچھ لوگ مفتیوں کے بہکاوے میں آکر ان کے خلاف ہوگئے اور طرح طرح سے ان کو اذیت دینے لگے۔ آخر ایک دن ان کو غصہ آگیا اور انھوں نے کہا۔ مفتیاں کی جڑ اللہ شہ کمال نے پٹی" خدا نے ان کی فریاد سنی۔ اس کے بعد سے مفتیوں کا اقتدار گرنا شروع ہوگیا اور آہستہ آہستہ سب نیست و نابود ہوگئے۔ اس کے بعد کمال بے روک ٹوک لوگوں کو پند و نصیحت کرنے لگے۔ بتدریج رجوع خلائق ہوا اور ان کی قدر و منزلت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔

ان کے صاحبزادے شاہ عماد الدین، حضرت شاہ موسیٰ ابوالمکارم اور حضرت نور الدین، اصحاب کشف و کرامات، مجاہدہ اور تزکیہ نفس میں بے نظیر تھے۔

ملا محمد مدرس، شاہ سکندر، شاہ موسیٰ ابوالکلام، شیخ جلال الدین، کہکہ ملتانی، شاہ یوسف غوث بھکری، شیخ عبدالرحمٰن سرہندی، خواجہ یمین الدین کلانوری، ان کے خلفاء میں سے تھے۔

ان کی ذات ستودہ صفات کے ذریعے سے سلسلۂ قادریہ کو کافی فروغ و عروج حاصل ہوا۔ یہ کیتھل کے صاحبِ ولایت تھے اور ان کا شمار کاملین اولیائے کرام میں ہوتا ہے۔

کیتھل میں ان کی اجازت کے بغیر کوئی آ نہیں سکتا تھا۔ اور اگر کوئی آجاتا تو اس کی سب صلاحیتیں سلب ہوجاتی تھیں۔ ان کے چھوٹے بیٹے نور الدین سے جب کرامت سرزد ہوئی تو انھوں نے ان کے سینے پر ہاتھ پھیرا ہاتھ کا پھیرنا تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا۔

حضرت شاہ کمال سنت نبوی کے سخت پابند تھے۔ غرض یہ کہ تمام روحانی اور اخلاقی خوبیوں سے آراستہ، ریاضت اور مجاہدہ میں بیمثال اور عبادت اور فقر میں بینظر تھے۔ فقر و غنا کا دامن کسی حال میں ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔ سرخ رنگ کا لباس زیب تن فرماتے تھے کبھی کبھی فوجی طرز کا لباس بھی پہنتے تھے۔

۱۹ جمادی الثانیہ، ۹۲۱ھ (یکم جولائی ۱۵۱۵ء) کو وفات پائی۔

شیخ گدائی پانی پتی

آغاز جوانی ہی سے خدا سے لو لگ گئی تھی۔ سپاہی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ جب اجمیر پہنچے تو شیخ سید حسین بزرگ کی شہرت سنی اور ان کے مرید ہو گئے کچھ دن ان کی خدمت کا شرف حاصل کیا اور پھر سیر و سیاحت پر نکل کھڑے ہوئے اور بیس سال تک دنیا کی سیر کرتے رہے "سندسور" پہنچے تو رخت سفر کھول دیا اور وہیں گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ روایت ہے کہ جہاں انھوں نے سکونت اختیار کی تھی وہاں ایک درخت تھا جس پر پچھلے کئی سال سے کوئی پھل نہیں لگا تھا۔ اسی باعث درخت کے مالک نے اسے کاٹ دینا چاہا تو شیخ گدائی نے اس سے کہا کہ اسے نہ کاٹو۔ اگر اس سال بھی پھل نہ لگے تو پھر کاٹ دینا۔ خدا کی شان اس سال اس پر سب سے زیادہ پھل لگے۔

محمد بن البرہان ہانسوی (قاضی محمد کمال الدین ہانسوی)

یہ فقہ کے مشہور عالم تھے۔ انھوں نے علم اپنے ماموں شیخ فخرالدین ہانسوی سے حاصل کیا تھا اور اس کے بعد درس و تدریس اور فتویٰ نویسی کا شغل اختیار کیا اور بالآخر تغلق شاہ (۱۳۲۵-۱۳۵۱ء) کے عہد میں قاضی القضات کے عہدے پر فائز ہوئے۔ محمد شاہ تغلق ان کی بہت عزت کرتے تھے اور ان کی صحبت کو اپنے لیے بہت غنیمت سمجھتے تھے۔

شیخ محمد ترک نارنولی

یہ ترکستان الاصل تھے۔ وہاں سے مہاجرت کر کے ہندوستان آئے اور نارنول میں بس گئے۔ وہاں کے لوگوں میں یہ "پیر ترک" یا "ترک سلطان" کے نام سے معروف تھے۔ کسی زمانے میں قصبہ، نارنول میں ایک حوض ہوا کرتا تھا۔ یہ جب ترکستان سے آئے تو اسی حوض کے کنارے اقامت اختیار کی۔

مجرد و متوکل اور تنہائی پسند تھے۔ انھوں نے نہ خود کسی کے ہات پر بیعت کی اور نہ کبھی کسی کو

مرید ہی بنایا۔

اوائل اسلام کے دنوں کی بات ہے کہ قصبہ نارنول میں مسلمان اقلیت اور ہندو اکثریت میں تھے اور ان میں اکثر مناقشات ہوتے رہتے تھے۔ ہندو ہمیشہ فرصت مغتنم کی تلاش میں رہتے۔ ایک روز عید کے دن نماز کے وقت مسلمانوں پر حملہ کردیا اور بہت سے مسلمانوں کو شہید کردیا۔ شیخ محمد ترک بھی ان میں سے ایک تھے ان سب شہدا کو حوض تہن پال کے کنارے دفن کردیا گیا تھا۔

محمد ترک مسکن مالوف میں دفن ہوئے۔ اسی مشہد میں دو اور شہید آسودہ ہیں۔ جو اوپر کی طرف ہے اسے بلند شہید اور جو نیچے کی طرف ہے اسے نشیب شہید کہتے ہیں۔ دونوں ہی حافظ قرآن تھے۔ کہتے ہیں کہ لوگوں نے ان قبروں سے تلاوت قرآن کی آوازیں سنی ہیں۔ شیخ محمد ترک کا مقبرہ ملجای خاص ہوا کرتا تھا۔

روایت ہے کہ ایک بار بادشاہ وقت سلطان محمد تغلق (۱۳۲۵-۱۳۵۱) نے نصیر الدین محمود چراغ دہلی کو زبردستی ٹھٹھا کی طرف روانہ ہونے کا حکم دیا۔ جب نارنول پہنچے تو شیخ محمد ترک کے مقبرہ کی زیارت کی۔ زیارت کے بعد نصیر الدین محمود چراغ دہلی (م:۷۵۷ھ/۱۳۵۶ء) نے کہا۔ جو کوئی اس روضہ کی زیارت کریگا، اس کی مشکلیں آسان ہو جائینگی۔ اس پر ایک گستاخ نے کہا ''آپ پر یہ جو زبردستی سفر کی مصیبت آن پڑی ہے یہ کیوں نہیں ٹلی؟'' ابھی نارنول سے کچھ ہی دور گئے تھے کہ بادشاہ کا قاصد آ پہنچا اور کہا پادشاہ نے واپس بلایا ہے۔

شیخ محمد ترک نے ۶۴۳ھ/۱۲۴۵ء میں جام شہادت نوش فرمایا تھا۔

مولانا محمد روشن نارنولی

ان کی حنفی علما میں غیر معمولی شہرت تھی۔ یہ اصل میں ٹاور کے رہنے والے تھے۔ یہاں سے ان کے بزرگ نقل مکان کر کے نارنول میں آ بسے۔ محمد روشن نارنول ہی میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم پہلے غوث گڑھ پھر رام پور میں ہوئی، جہاں بعض کتب درسیہ شیخ سلام اللہ اور مولانا احمد خان رامپوری اور دوسرے علما سے پڑھیں۔ کہا جاتا ہے کہ فہم و ادراک اور حافظہ میں یکتائے زمانہ تھے۔

محمد سعید انبالوی

ان کے والد کا نام محمد یوسف تھا۔ محمد سعید اپنے وقت کے مشہور چشتی مشائخ گنے جاتے ہیں۔
یہ شیخ ابوالمعانی ایٹھوی کے مرید تھے۔ آخری ایام میں ترک دنیا کر کے زہد و عبادت میں زندگی بسر کرنے
لگے۔ مختلف اوقات میں امرا سے جو تحفے تحائف ملتے تھے، دن کے دن لوگوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔
۵ رمضان ۱۱۰۳(۹ جولائی ۱۶۹۳ء) کو وفات پائی۔ ان کی قبر کہرام میں واقع ہے۔

مولوی محمد مرید صاحب ۔ فیروز پور جھرکہ

یہ آفریدی النسل تھے۔ تبلیغ دین میں مشغول رہتے اور اسی سلسلہ میں انھوں نے جو کارنمایاں
انجام دیے ہیں ان کا بیان کرنا قلم کے بس کی بات نہیں ہے۔ اکثر وعظ اور ارشاد کی محفلیں جماتے تھے۔
۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں بھی انھوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا۔ تعلیم سے
ان کو بہت رغبت تھی فیروز پور جھرکہ کا ''حافظ الاسلام مدرسہ'' سب سے پہلے انھوں نے ہی قائم کیا تھا۔
یہ مدرسہ ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء میں قائم ہوا تھا۔
ان کا مزار فیروز پور جھرکہ و کامینڈو کے درمیان واقع ہے۔

مولوی مراد اللہ تھانیسری

مولوی مراد اللہ تھانیسری، فاروقی نسب، مجددی و مظہری مشرب، مولوی نعیم اللہ بہرائچی کے
جانشین تھے۔ لکھنؤ میں چالیس سال سے زیادہ مجددیہ مظہریہ طریقہ کی ترویج میں مشغول رہے۔ جہاں
کو شرک و بدعت کی تاریکی سے نجات بخشی اور ترک دنیا، تجرید، اتباع، سنت نبوی، تزکیہ نفس اور تہذیب
باطن میں مخلوق کی رہنمائی فرمائی۔ ان کے عہد کے عرفاء و صلحاء ان کے جلالت منزلت پر اتفاق فرماتے
تھے۔ ۸۲ سال کی عمر میں ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲-۳۳ء) میں انتقال ہوا۔
مولوی ابوالحسن نصیر آبادی، ان کے اجل خلفاء میں سے تھے۔

منتخب الدین ہانسوی

ناصرالدین نعمانی کے بیٹے تھے اور ۷۷۵ھ(۱۳۷۳ء)میں ہانسی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت دلی میں انجام پائی۔ تعلیم طریقت حضرت نظام الدین اولیاء سے حاصل کی اور انھی سے خلافت بھی پائی۔ بعد کو دولت آباد دکن کو اپنا وطن بنالیا اور وہاں ایک غار میں سکونت اختیار کر لی۔ پھر ایک مسجد تعمیر کی اور اس کو اپنا مستقل مسکن بنایا۔ بہت لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ ۷ ربیع الاول ۷۰۹ھ (۱۴ ستمبر، ۱۳۰۹ء) کو وفات پائی۔ ان کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے۔

شیخ مودود لاری پانی پتی

بابا نظام ابدال کے مرید اور عبدالغفور لاری (م: ۹۱۲ھ/۱۵۰۶ء) کے شاگرد تھے۔ شیخ امان پانی پتی (م: ۹۵۷ھ/۱۵۵۰ء) علم تصوف میں ان کے شاگرد تھے۔ تجرید اور تفرید کے میدان میں ان کے پاؤں مستحکم جمے ہوئے تھے؛ وحدت اور توحید کے رموز سے کلی واقفیت تھی۔ وجد اور اسرار وجد کے صحیفے ان کے مطالعے سے گذر چکے تھے۔

روایت ہے کہ ان کی باطنی تربیت مولانا عبدالرحمن جامی (۸۱۷-۸۹۸ھ/۱۴۱۴-۱۴۹۲ء) نے کی تھی۔ بعض نے ان کی نعمت اللہ ولی اور شاہ قاسم انوار (م: ۸۳۷ھ/۱۴۳۳ء) سے ملاقات کا بھی ذکر کیا ہے۔

وہ سلطنت مغلیہ کے بانی ظہیرالدین بابر کے زمانے (۱۵۲۶-۱۵۳۰) میں ہندوستان آئے۔ مدتوں دارالسلطنت آگرہ میں گوشہ نشین رہنے کے بعد پانی پت کا رخ کیا اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک عبدالغفور پانی پتی کے فرزندوں کی خواہش اور دوسری، شیخ امان کی کشش۔ ان کی تمام عمر ظاہری اور باطنی علوم کے درس میں گذری۔ رمضان ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء[1] میں وفات پائی۔ ان کی قبر شہر پانی پت میں شیخ امان کی قبر سے متصل ہے۔

---

[1] ۹۰۷ھ/۱۵۰۱-۲ء: علماے ہند (۴۷۳)

سید میر ہاشم نارنولی

سید میر ہاشم بن سید حسین، معروف بہ رسول نما بن سید جوہرالحسینی، نارنول کے رہنے والے تھے۔ لیکن بعد کو دلی میں متوطن ہوگئے تھے۔ اپنے زمانے کے مشہور اصفیا اور مشائخ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۱ء میں وفات پائی۔

شیخ نظام الدین نارنولی

شیخ نظام الدین نارنولی، شیخ خانو[1] (تولد: ۹۴۰ھ/۱۵۳۳ء) چشتی گوالیاری کے مرید تھے جو سلسلۂ چشتیہ سے تعلق رکھتے تھے اور گوالیار میں متوطن تھے۔ گوالیار مین متوطن ہونے کی وجۂ خاص یہ تھی کہ ان کے والد عبدالکریم، شیخ محمد غوث گوالیاری کے دوستوں میں سے تھے۔ اور انہی کے اصرار پر ان کے س تھ گوالیار چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔

شیخ نظام نے تربیت اور خلافت اپنے بڑے بھائی شیخ اسمعیل سے حاصل کی جو صاحب ذوق و شوق تھے۔ اغنیا، فقرا شاہ اور گدا، ان کے لئے سب برابر تھے۔ وہ کسی کو تعظیم نہیں کرتے تھے۔

شیخ نظام تقریباً چالیس سال تک مسند ارشاد پر متمکن رہے۔ ابتدائے جوانی سے لے کر آخر تک شاید ہی کسی سال ایسا ہوا ہو کہ وہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی زیارت اور عرس میں شمولیت کو نارنول سے پیدل چل کر دلی (۱۱۰ کیلومٹر) نہ آئے ہوں۔ جب عمر ضعیف کو پہنچے تو حضرت کا عرس نارنول ہی میں منانے لگے۔

شیخ فرخ شاہ اور شیخ عاشق محمد ان کی اولاد میں سے تھے۔ شیخ کمال الدین متوکل ان کے خلیفہ تھے۔

نظام نارنولی نے ۹۹۷ھ[2] (۱۵۸۸ء) میں وفات پائی۔ آہ نظامی ان کی تاریخ وفات ہے۔

---

[1] سفینۃ الاولیا: ۲۲۹- فانو: طبقات شاہجہانی: ۲۰۵: خانو: خزینۃ الاصفیا: ۱: ۴۴۵: خانور

[2] سفینۃ الاولیا: ۲۲۹: ۹۹۰ھ؛ خزینۃ الاصفیا: ۴۴۵: ۹۹۰ھ

حوالہ جات

شیخ آدھو حصاری (ص-۱۱۳)

گلزار ابرار:۳:۲۷

مولوی احمد اللہ پانی پتی (ص-۱۱۴)

تذکرہ علمای ہند (فارسی):۱۴

شیخ احمد مجد شیبانی نارنولی (ص-۱۱۴)

اخبار الاخیار: ۱۹۰-۱۹۲؛ تذکرہ علماے ہند (اردو): ۸۵؛ خمخانہ تصوف: ۳۱۹؛ حدائق الحنفیہ: ۳۹۰؛ گلزار ابرار: ۲۲۸؛ خزینۃ الاصفیاء: ۱: ۴۱۲-۴۱۵؛ تذکرہ صوفیائے میوات: ۲۴۵؛ تذکرہ مشائخ ہند۔۱: ۱۵۸؛

شاہ اعلیٰ چشتی پانی پتی (ص-۱۱۶)

خزینۃ الاصفیا:۱:۴۵۹

اللہ دین مجذوب نارنولی (ص-۱۱۶)

تذکرہ صوفیائے میوات: ۲۵۷

شیخ بدھنی کیتھلی (ص-۱۱۷)

سیر المتاخرین: ۱: ۲۷۴؛ اخبار الاخیار: ۸۴؛ خیر المجالس: ۳:۱۷

شیخ برہان الدین ہانسوی (ص-۱۱۸)

اخبار الاخیار: ۴۷؛ گلزار ابرار: ۱۰۸

شیخ بہاء الدین جیندی (ص-۱۱۸)

سرہند میں فارسی ادب: ۳۰۶

سید تاج الدین شیر سوار نارنولی (ص-۱۱۹)

طبقات شاہجہانی: ۱۷؛ اخبار الاخیار: ۱۰۰؛ تذکرہ صوفیائے میوات: ۴۶۲؛ خزینۃ الاصفیا: ۳۶۶؛ تذکرہ مشائخ ہند:۱:۱۵۱

حضرت شیخ جلال الدین محمد کبیر الاولیا پانی پتی (ص-۱۲۰)

خمخانہ تصوف: ۱۷۹؛ ایتھے: ۳۸۵؛ ب؛ خزینۃ الاصفیا:۱: ۳۶۱؛ سیر الاقطاب: ۱۹۷؛ تذکرہ مشائخ ہند: ۱:۱۵۲

شیخ جمال الدین دہرسوی (ص-۱۲۳)

سیر المتاخرین: ۲۸۰؛ آئین اکبری: ۳: ۴۱۸

حضرت شیخ (نجم الحق) چاپن میواتی (ص-۱۲۳)

علماے ہند (اردو): ۱۴۵، گلزار ابرار: ۳۱۲؛ نزہۃ الخواطر: ۴: ۸۰؛ تذکرہ صوفیاے میوات: ۲۹۰

شیخ حسین انبالوی (ص-۱۲۴)

نزہۃ الخواطر: ۵: ۱۳۳

شیخ سید حسین سونی پتی (ص-۱۲۵)

گلزار ابرار: ۴۱۴

شیخ حمزہ دھرسوی (ص-۱۲۶)

خمخانہ تصوف: ۳۴۵؛ اخبار الاخیار: ۱۹۲-۱۹۳؛

تذکرہ صوفیائے میوات: ۲۵۸؛ خزینۃ الاصفیا: ۴۲۵
حضرت میاں راج سوندھی (ص-۱۲۷)
تذکرہ صوفیائے میوات: ۵۱۴
سکندر کیتھلی (ص-۱۲۹)
نزہۃ الخواطر: ۵: ۱۵۸
شیخ شبلی پانی پتی (ص-۱۲۹)
خزینۃ الاصفیا: ۱: ۳۹۳؛ سیر الاقطاب: ۲۲۶
حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی (ص-۱۳۰)
سیر الاقطاب: ۱۸۵؛ تذکرہ مشائخ ہند: ۱: ۱۲۹؛ خمخانہ تصوف: ۱۲۳
قاضی شمس الدین شیبانی نارنولی (ص-۱۳۲)
اخبار الاخیار: ۱۵۵؛ علمای ہند (فارسی): ۸۵؛ تذکرہ صوفیائے میوات: ۲۴۲
شیخ شہاب الدین خطیب ہانسوی (ص-۱۳۳)
اخبار الاخیار: ۸۵
شیخ عاشق محمد نارنولی (ص-۱۳۴)
طبقات شاہجہانی: ۲۰۷، ۳۵۶
عبدالسلام پانی پتی (ص-۱۳۴)
نزہۃ الخواطر: ۵: ۲۲۵؛ علماے ہند (اردو): ۵۷۹
مولانا عبدالغفور لاری پانی پتی (ص-۱۳۵)
طبقات شاہجہانی: ۱۳۵؛ سفینۃ اولیا: ۱۰۷
قاضی عبدالقادر پانی پتی (ص-۱۳۶)
نزہۃ الخواطر: ۵: ۲۳۶

شیخ عبدالکبیر بالا پیر پانی پتی (ص-۱۳۶)
خزینۃ الاصفیا: ۱: ۴۱۸
شیخ عثمان زندہ پیر پانی پتی (ص-۱۳۷)
سیر الاقطاب: ۲۲۹
عزیز الدین خان پلولی (ص-۱۳۷)
تاریخ محمدی: ۹۴
سید عطاء اللہ نارنولی (ص-۱۳۸)
تاریخ محمدی: ۱۲۰
مخدوم مولانا عماد الدین غوری نارنولی (ص-۱۳۸)
اخبار الاخیار: ۲۰۶؛ تذکرہ صوفیائے میوات: ۲۶۰
غربتی حصاری (ص-۱۴۰)
منتخب التواریخ: ۳/۴۰۱
حضرت سید غوث علی شاہ پانی پتی (ص-۱۴۰)
خمخانہ تصوف: ۹۵۲؛ ماہ وسال: ۲۹۰؛ تلامذہ غالب (حواشی ۴۸)
شیخ فرخ شاہ نارنولی (ص-۱۴۲)
طبقات شاہجہانی: ۳۱۱؛ تذکرہ صوفیائے میوات: ۴۷۰؛ نزہۃ الخواطر: ۵: ۳۰۵
شیخ فیض اللہ نارنولی (ص-۱۴۲)
طبقات شاہجہانی: ۳۰۲؛ تذکرہ صوفیائے میوات: ۳۱۱؛ گلزار ابرار: ۵۶۱
قطب الدین ہانسوی (ص-۱۴۳)
نزہۃ الخواطر: ۵: ۳۱۲؛ بزم تیموریہ: ج: ۳: ۳۱

حضرت شاہ کمال کیتھلی (ص-۱۴۴)

خمخانہ تصوف: ۳۰۵

شیخ گدائی پانی پتی (ص-۱۴۷)

طبقات شاہجہانی: ۳۰۶؛ گلزار ابرار: ۵۷۱

محمد بن البرہان ہانسوی (ص-۱۴۸)

نزہۃ الخواطر: ۲: ۱۲۹

شیخ محمد ترک نارنولی (ص-۱۴۸)

اخبار الاخیار: ۵۳؛ گلزار ابرار: ۱۶۸؛ خمخانہ تصوف: ۴۶-۴۸؛ تذکرہ صوفیاے میوات: ۱۹۸

مولانا محمد روشن نارنولی (ص-۱۵۰)

نزہۃ الخواطر: ۴۴۰

محمد سعید انبالوی (ص-۱۵۱)

نزہۃ الخواطر: ۶: ۳۱۱

مولوی محمد مرید صاحب-فیروز پور جھرکہ (ص-۱۵۱)

تذکرہ صوفیاے میوات: ۳۹۲

مولوی مراد اللہ تھانیسری (ص-۱۵۲)

علمائے ہند (اردو): ۴۹۰؛ نزہۃ الخواطر: ۷/۴۶۹

منتخب الدین ہانسوی (ص-۱۵۳)

نزہۃ الخواطر: ۲: ۱۷۱

شیخ مودود لاری پانی پتی (ص-۱۵۳)

گلزار اذکار: ۲۳۳؛ طبقات شاہجہانی: ۱۵۰؛ آئین اکبری (انگریزی): ۴۱۶؛ سیر المتاخرین: ۲۷۹؛ اخبار الاخیار: ۲۴۰؛ علمائے ہند (اردو): ۲: ۱۴۷

سید میر ہاشم نارنولی (ص-۱۵۴)

تاریخ محمدی: ۸؛ نزہۃ الخواطر: ۶: ۴۱۷

شیخ نظام الدین نارنولی (ص-۱۵۵)

طبقات شاہجہانی: ۲۰۵، ۳۱۱، ۳۵۶؛ سفینۃ الاولیا: ۲۲۹ خزینۃ الاصفیا: ۱: ۴۴۵؛ منتخب التواریخ: ۳: ۴۴؛ نزہۃ الخواطر: ۴: ۳۷۸

باب ششم

شعرا

مولوی ابوالحسن شیدائی فرید آبادی

ایام خورد سالی میں اپنے وطن مالوف فرید آباد سے ہجرت کر کے شاہجہاں آباد چلے آئے اور یہاں مولوی امام بخش صہبائی (۱۲۲۱-۱۲۷۴ھ/۱۸۰۶ء-۱۸۵۷ء) کی خدمت میں رہ کر علم فارسی کی تکمیل کی۔ اس سے فارغ ہو کر مدرسہ شاہجہاں آباد (قدیم دلی کالج) میں وظیفہ سرکار سے سرفراز ہو کر علم ہندسہ و ریاضی میں وہ لیاقت پیدا کی کہ رشک امثال واقران ہو گئے۔ ان تمام علوم میں ان کی بیمثل مہارت دیکھ کر جلد ہی انھیں ستر روپے مشاہرے پر مدرسے اکبر آباد میں مدرس مقرر کر دیا گیا۔ لیکن اس تقرر کی اصلی وجہ ان کی فارسی میں اعلیٰ درجے کی قابلیت تھی۔ لیکن ابھی وہ اپنے اس عہدے پر ٹھیک سے جم بھی نہیں سکے تھے کہ ایک درویش صافی ضمیر روشن دل کی طرف مائل ہو گئے۔ شاید یہ اسی درویش کی نظرِ عنایت کا نتیجہ تھا کہ عینِ عنفوان شباب میں دنیا سے بے نیاز اور انقطاع الی اللہ کی سعادت حاصل ہو گئی۔

انھیں شروع سے فارسی شعر گوئی کی فکر دامنگیر رہی۔ پہلے کچھ دن حسن تخلص کیا بعد کو اسے ترک کر کے شیدائی لکھنے لگے۔ خوبی مضامین اور متانت عبارت، چستی ترکیب اور تازگی طرز ان کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سبک در پہلو یم بنشین بنہ رطل گران بر کف | کہ می بالا بردکار نشاط نوجوانی را
این طفل اشک بین کہ بخلق آشکار کرد | در دل ہر آنچہ بود ز عشقت نہان مرا
ساقی کفایت ست زچشم تو گردشی | دیگر میازمائی بر طل گران مرا

☆☆☆

از آن ہدایائی کہ در پای عزیزان افگنند جز سری برکف بناشد تحفہ مقدورما
نیست این سرلائق پاپش یقین دارم حسنؔ می برد پای ملخ پیش سلیمان مورما

☆☆☆

صاحب نظران رانکشد دل بہ سوی خلد روی تو درجنت وابروت کلیدست
ہندست بہشتی کہ گرد بر در طوبیٰ آن سرد بلندی کہ ازین باغ دمیداست

☆☆☆

گرزتاب عکس رویت آب دریا آتش است از تف داغ دل من خاک صحرا آتش است
اینقدر فہمیدہ ام از بحث کفرو دین حسنؔ روی خوبان جنت است وخوی آنہا آتش است

☆☆☆

احتشام الدین شوکتؔ نارنولی

ان کا نام احتشام الدّین اور تخلص شوکتؔ تھا۔ ان کے والد کا نام حافظ قاضی حبیب الدّین تھا۔ یہ چھ حقیقی بھائی تھے۔ مولانا تسلیم، منشی ذکا الدین، مولانا مفتی، غلام مبارز الدّین، مولانا مبین اور منشی ارشادالدّین کلیم ۔''تذکرہ شعرائے جے پور'' کے مصنف احترام الدّین شاغل بھی انھیں کے بیٹے تھے۔

شوکت ۲۱ ربیع الاخر ۱۲۸۱ھ (۲۳ ستمبر ۱۸۶۴ء) کو نارنول میں پیدا ہوئے لیکن بعد کو انھوں نے مستقل سکونت جے پور میں اختیار کر لی تھی۔ حضرت محمد شاہ سے بیعت تھے۔

فارغ التحصیل ہو کر جے پور میں محکمۂ پولیس میں ملازم ہو گئے اس لیے عرصۂ دراز تک وہیں قیام رہا ۔۱۱ اکتوبر ۱۹۱۶ کو جے پور ہی میں وفات پائی۔ بیرون ''گھاٹ دروازہ'' آسودۂ خواب ابدی ہیں۔

انھوں نے فارسی میں دو غیر مطبوعہ تصانیف (۱) مجموعہ اوراد و وظائف (۲) بیاض تواریخ، اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

پہلی تصنیف فارسی کے علاوہ اردو اور عربی نثر پر مشتمل ہے اور دوسری فارسی کے علاوہ اردو نظم و تاریخی قطعات کا مجموعہ ہے۔

تاریخ گوئی سے ان کو خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ ایک مجموعہ قطعات تاریخ کا موجود ہے ہر مادہ اپنے واقعہ پر دلالت کرتا ہے، اور یہی تاریخ گوئی کا کمال ہے۔ قطعات تاریخ کے دو نمونے درج ذیل ہیں۔

شہر سانبھر تیرہ و تاریک گشت شدو صال سید روشن علی
شوکت تاریخ گو، سالش بگفت انتقال سیدروشن علی
۱۳۲۲ھ

تاریخ ترقی منشی مراری لال
مراری لال با سررشتہ داری ترقی یاب شد از فضل واھب
بگو شوکت پی سال ترقی ترقی مراری لال صاحب
۱۳۲۳ھ

مرزا احمد بیگ خان کامل تھانیسری

کامل دراصل اصفہان کے رہنے والے تھے۔ اپنے والد مرزا افضل کے ساتھ ہندوستان آئے اور عالمگیر بادشاہ کے دربار میں اعلیٰ رتبے پر فائز ہوئے۔ یہ تھانیسر کے قلعے کے قلعدار بھی مقرر ہوئے اور وہیں پر وفات پائی۔

ان کے بارہ میں زیادہ معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔ بس تذکرہ ''روز روشن'' میں ان کے بارہ میں چند سطر اور دو فارسی شعر درج ہیں۔

اگر تنگ است جابر اہل شہر از نالہ زارم کسی نگرفتہ است دستِ من دامان صحرارا
غم زہر دل شعری شد سوی من می آید چون غریبی کہ از غربت بوطن می آید

احمد بن محمد ہانسوی

چشتی سلسلہ کے مشہور مشائخ میں سے تھے۔ ہانسی میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ طریقت کا درس شیخ فرید الدین اجودھنی سے حاصل کیا۔ ان کا فارسی دیوان طبع ہو چکا ہے، اگرچہ نظر سے نہیں گذرا۔ ۶۵۹ھ (۱۲۶۰ء) میں انتقال ہوا۔

مولانا احمد تھانیسری

مولانا احمد تھانیسری شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی (م: ۷۵۷ھ/۱۳۵۶ء) کے مریدوں میں سے تھے۔علوم ظاہری میں بہت مہارت حاصل تھی۔اگر چہ مولانا خواجگی سے مواخات تھے، مگر دلی کو چھوڑ کر کالپی جانا منظور نہیں کیا، یہاں تک کہ امیر تیمور گورگانی (۷۷۰-۸۰۷ھ/۱۳۶۸ء-۱۴۰۴ء) کی فوجوں نے دلی شہر کو تاخت و تاراج کر دیا۔مولانا احمد اپنے بچوں کے ساتھ اسیر ہوئے۔فتنہ سرد پڑ جانے پر جب ان کے کمالات و فضایل ظاہر ہوئے تو انھیں رہا کر دیا گیا اور صاحبقران نے ان کے لیے ایک خانقاہ قائم کرنے کی خواہش ظاہر کی، لیکن مولانا احمد نے منظور نہیں کیا چونکہ سب بھائی برداری اور یار دوست کالپی میں متوطن ہو گئے تھے، اس لیے انھوں نے بھی وہیں سکونت اختیار کرنے کی خواہش ظاہر کی۔امیر تیمور نے بڑی عزت و احترام کے ساتھ ان کو دلی سے کالپی کے لیے روانہ کیا۔وہیں ۸۲۰ھ (۱۴۱۷ء) میں وفات پائی۔کالپی کے قلعے میں مدفون ہیں۔

مولانا ایک عالم و فاضل[1] اور خوش تقریر شاعر تھے ان کا ایک قصیدہ فصاحت و بلاغت کا نمونہ ہے۔شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۹۹۸-۱۰۵۲ھ/۱۵۸۹-۱۶۴۲ء) نے ''اخبار الاخیار'' میں ان کے کچھ عربی اشعار نقل کیے ہیں۔فارسی اشعار کے نمونے نہ مل سکے۔

سید احمد شفیع نیرؔ فرید آبادی

سید احمد شفیع نیرؔ ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۷ء میں فرید آباد میں پیدا ہوئے، جو دلی کے مشرق میں ۳۰ کیلومیٹر دور ہے۔ان کا شمار فرید آباد کے مشہور رؤسا میں ہوتا تھا۔ان کی شادی نواب علاء الدین احمد خان علائی والی لوہارو کی دختر نیک اختر رضیہ سلطان بیگم سے ۱۸۸۹ء میں ہوئی تھی۔

نیرّ ادیب اور شاعر تھے۔انھوں نے ایک ناول ''کینولا'' کے عنوان سے بھی لکھا تھا۔فرید آباد سے ایک ماہوار رسالہ ''تہذیب'' بھی نکالتے رہے۔انھوں نے اپنا کوئی دیوان جمع نہیں کیا۔ان کا بہت سارا کلام ''پیام یار''، لکھنؤ اور یو۔پی کے دوسرے شہروں سے نکلنے والے رسالوں میں منتشر پڑا ہے۔

۳۹ سال کی عمر تھی جب ۱۹۰۶ء میں فرید آباد ہی میں وفات پائی۔

---

[1] سلطان فیروز شاہ تغلق نے انھیں دربار میں کاتب مامور کیا تھا۔ہریانہ کا اتہاس (ہندی): ۱۹۳-۹۴

۱۹۴۷ء کی فرقہ وارانہ آگ میں شفیع نیر اور ان کے بیٹے سید ہاشمی فرید آبادی کے کتب خانے جل کر خاک ہو گئے۔ نیر کی ایک نوٹ بک کسی طرح سید ہاشمی فرید آبادی کے ساتھ لاہور چلی گئی۔ ان کے ذوق سخن کا کسی قدر اندازہ ان اشعار سے ہو سکتا ہے جو اس میں تھے۔ نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

صحن گلستان رشک بہشت است ‏ ‏ ‏ ‏ از گل وریحان رشک بہشت است
چون گل عارض تازہ وخرّم ‏ ‏ ‏ ‏ ہر گل خندان رشک بہشت است
غیرت خور آن نور مجسم ‏ ‏ ‏ ‏ کوچہ جاناں رشک بہشت است
از گل دانش حضرتِ نیّر ‏ ‏ ‏ ‏ سینہ سوزاں رشک بہشت است

☆☆☆

مبارک باد گویاں ماہ عید روز ہا آمد ‏ ‏ ‏ ‏ زگردوں جام شیر از بہر فرخ میر زا آمد
امیر الدّین بہادر فخر دین ودانش ‏ ‏ ‏ ‏ رخش مہر ضیاء آمد کفش بہر عطا آمد
قیاسِ طاعتِ انجم ازین جامی توان کردن ‏ ‏ ‏ ‏ کہ نیرّ را دل از مہر تو سر گرم ثنا آمد

☆☆☆

میر احمد علی حبؔ فرید آبادی

میر احمد علی حبؔ فرید آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد قاضی تھے تیرہ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ اس کے بعد راجہ بہادر سنگھ بہادر (ولد فتح بہادر سنگھ) شاگرد مرزا حاتم علی[1] مہر نے حب کی پرورش کی۔

میر احمد علی کو شروع سے پڑھنے لکھنے سے بہت دلچسپی تھی۔ چنانچہ عربی اور فارسی میں معقول دستگاہ حاصل کر لی۔ شعر کہنے لگے تو حکیم عزت اللہ خان عشق[2] سے مشورہ کرنے لگے۔

فارسی اشعار کے نمونے نہ مل سکے۔

---

[1] شیخ ظہور الدین حاتم: مجموعہ نغز: ۱۱۱؛ طبقات شعرائے ہند: ۱۸۰

[2] عاشق: پنجاب کے قدیم اردو شعرا: ۲۳۰

اسلام احمد ہادی رہتکی

یہ ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ رہتک میں دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اپنے زمانے کے ممتاز ہریانوی شاعر تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے خلافت کے دوران قومی تحریک میں بڑے جوش وخروش سے حصہ لیا۔ فارسی اشعار کے نمونے نہیں مل سکے۔

الطاف حسین حالی پانی پتی

مولوی الطاف حسین انصاری، جنھوں نے شروع میں چندے خستہ تخلص کیا اور بعد کو اسے بدل کر حالی کرلیا اپنے زمانے کے مشہور شخص تھے۔ ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں پانی پت کے محلّے انصار میں پیدا ہوئے۔ ان کا مادری سلسلہ ۳۶ واسطوں سے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک اور پدری سلسلہ ۲۹ واسطوں سے ان کے جد اعلیٰ حضرت رسول کریم صلعم کے مدینہ میں اولین میزبان حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔

ان کی والدہ کسی دماغی عارضہ کی مریض تھیں۔ اس پر بدقسمتی یہ کہ ۱۸۴۵ء میں جب حالی ۸-۹ برس کے تھے، ان کے والد ''خواجہ ایزد بخش'' کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ان کی تعلیم وتربیت کی دیکھ بھال ان کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین مظہر اور بڑی بہن نے کی۔

اس زمانے کے رواج کے مطابق گھر ہی پر پہلے قاری ممتاز علی کی نگرانی میں قرآن حفظ کیا۔ پھر سید جعفر علی (ممنون کے برادر زادے اور داماد بھی) سے فارسی زبان کا درس لیا۔ اسی اثنا میں گھر والوں نے خانہ داری کا بوجھ ان کے کندھوں پر رکھ دیا، یعنی ان کا نکاح ان کے ماموں باقر علی کی بیٹی ''اسلام النسا'' سے کر دیا گیا، لیکن اس سے ان کا تعلیم کا شوق ختم نہ ہوا۔ ۱۷ برس کی عمر تھی جب یہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور علم وفضل کے گہوارے دلی آ پہنچے اور مولوی نوازش علی کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئے۔ سال بھر ان کی خدمت میں رہ کر کچھ عربی پڑھی۔ ان کے علاوہ انھوں نے مولوی فیض الحسن سہارنپوری اور مولوی امیر احمد اور شمس العلما میاں نذیر حسین سے بھی عربی پڑھی۔ ۱۸۴۲ء میں نواب محمد مصطفےٰ خان شیفتہ کے مصاحب اور ان کے مجھلے صاحبزادے نقش بند خان مہجور کے اتالیق مقرر ہوئے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ حالی کو ان تمام اکابر اور علمائے عصر

سے ملنے اوران سے استفادہ کرنے کا موقع مل گیا، جوشیفتہ کے دوست تھے۔ مثلاً مفتی صدرالدین، احمد خان نیّر رخشان، حکیم احسن اللہ خان وغیرہ۔ بلکہ غالب سے تو اپنے کلام پر باقاعدہ اصلاح بھی لینی شروع کردی۔ حالی تخلص انھوں نے اسی زمانے میں اختیار کیا تھا

شیفتہ کی وفات (۱۸۶۹ء) کے بعد حالی لاہور چلے گئے وہاں وہ سرکاری بک ڈپو میں ان اردو کتابوں کی نظر ثانی اور زبان کی اصلاح پر مقرر ہوئے جو بک ڈپو کی طرف سے شائع ہوتی تھیں۔ لاہور میں تقریباً چار سال قیام کے بعد وہ ۱۸۷۴ء کے آخر میں ۱۸۷۵ کے شروع میں دلی آگئے اور اینگلو عربک اسکول میں فارسی اور عربی کے مدرس مقرر ہو گئے۔ یہیں ان کی ملاقات سرسید احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) سے ہوئی جنھوں نے ان کی ملاقات سرآسمان جاہ بہادر وزیر اعظم حیدرآباد سے کروائی۔ انھوں نے ان کا ۷۵ روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کردیا۔ بعد کو یہ بڑھ کر سو روپیہ ہوگیا۔ چونکہ سو روپے ان کی بسر اوقات کے لیے کافی نہ تھے، اس لیے حالی ملازمت سے مستعفی ہو کر پانی پت آگئے اور باقی عمر علم وادب کی خدمت میں بسر کردی۔ حکومت وقت نے بھی ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے جون ۱۹۰۴ء میں انھیں ''شمس العلما'' کے خطاب سے سرفراز کیا۔

اولاد میں دو بیٹے خواجہ اخلاق حسین اور خواجہ سجاد حسین اور ایک بیٹی عنایت فاطمہ تھی۔ اردو کے مشہور افسانہ نگار خواجہ احمد عباس کی والدہ، حالی کے چھوٹے بیٹے سجاد حسین کی صاحبزادی ہی تھیں۔

حالی نے ۷۷ برس کی عمر میں یکم جنوری ۱۹۱۵ء کے اولین وقت (شب کے ڈھائی تین بجے) پانی پت میں انتقال کیا۔ حضرت شاہ شرف الدین بوعلی قلندر کی درگاہ کے صحن میں دفن ہوئے۔

عربی اور اردو کے علاوہ فارسی میں بھی یکساں دستگاہ تھی۔ ان کا ایک مختصر مجموعہ ان کی وفات سے چند ماہ پہلے ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا تھا۔

نمونے کے طور پر ان کے فارسی کے چند شعر درج ذیل ہیں:

من زرویش معنی دیدہ ام   آنچہ دل بربست آنی دیگر است

☆☆☆

بہ طبعم ساز گار افتاد دردش   مرا پرہیز از درمان است

☆☆☆

گربگیرد، ہمہ عیب است چہ عیب وچہ ہنر
ورپذیرد ، ہمہ زیبا ست ، چہ زیبا وچہ زشت

☆☆☆

چونهد گوش بہر ترانہ ما   رود از یاد ما فسانہ ما
درسراب آب خضر میجوی   ای وفا جستہ درزمانہ ما

☆☆☆

بی سبب رنجی و گوئی گلہ زیبا[1] نبود   طاقت جو رتو در حوصلہ مانبود
ہمرہ غیرمیا، گر بخیالم گذری   جز تو درسینہ م از تنگی دل جانبود

☆☆☆

از چشم جہاں بین چہ زبان اہل نظررا   ہر سمت کہ بینند بسوی نگرانند
حد نظر آنست کہ رونق نتوانديد   پیداست کہ این مدعیان بی بصر انند

☆☆☆

ای ہیچ بہ ہیچ خود نمائی تا چند   خود بینی و خویشتن ستائی تا چند
چون می دانی کہ جز کف خاک نہ ای   پس این ہمہ دعوای خدائی تا چند؟

☆☆☆

راز تو بلب نمی پسندم   ہم ساز بسوزد ہم نوارا
از سختی دہر رو نتابم   دانم کرم ستم نما را
کردیم گناہ و فاش گفتیم   بپذیر گناہ بی وفا را
حالی! چہ زنی تو دم زتوحید   چون تا بلدی رہ خدارا

☆☆☆

امام الدّین فدؔافریدآبادی

امام الدّین فدؔادہلوی، دراصل فریدآباد کے رہنے والے تھے[2]۔ نواب علی وردی خان مہابت جنگ کی عملداری کے زمانے میں دلی سے ہجرت کر کے بنگال میں سکونت پذیر ہوئے۔

''گلشن ہند کے مصنف'' علی ابراہیم خان کے مطابق فدؔا ۱۱۸۴ھ (۱۷۷۰ء) میں ان کو اشعار

---

[1] بہتر تذکرہ شعرای پنجاب: ۴۲۱
[2] ''عیارالشعرا'' کے مصنفت خوب چند ذکا کے مطابق وہ لکھنو کے رہنے والے تھے۔ عیارالشعرا-۲۸۸

دکھاتے تھے۔ عشقیؔ کا حوالہ دیتے ہوئے اسپرنگیر نے لکھا ہے کہ فداؔ، ہدایتؔ[1] کے شاگرد تھے۔ ان کو میر تقی قلی خان فراقؔ[2] کا شاگرد بھی بتایا جاتا ہے۔

سرورؔ نے اپنے تذکرہ منتخبہ میں لکھا ہے کہ فدا فارسی اور ریختہ دونوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی کا دیوان چھوڑا ہے لیکن افسوس کہ نہ تو کہیں دیوان مل سکا اور نہ ہی کوئی فارسی کا شعر۔

حافظ امام بخش زارؔ تھانیسری

حافظ امام بخش زار اگرچہ تھانیسر کے رہنے والے تھے لیکن مستقل قیام دلی میں رہا۔ پیدائش کے چھ ماہ بعد چیچک کی بیماری میں بینائی جاتی رہی۔ اللہ تعالیٰ نے ظاہری آنکھوں کے عوض دیدۂ دل کو روشن کر دیا۔ علم فارسی و علم موسیقی میں خوب دخل رکھتے تھے۔ اپنا فارسی کلام صہبائی کو دکھاتے رہے۔ ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) میں وفات پائی۔ افسوس نمونہ اشعار نہ مل سکا۔

مولوی امام بخش صہبائیؔ تھانیسری

مولانا امام بخش صہبائی اپنے وقت کے بہت بڑے فارسی ادیب، مصنف اور شاعر تھے۔ ان کی فارسی دانی اور علمیت کا ڈنکا تمام ہندوستان میں بجتا تھا اور آج تک ان کی شہرت بدستور قائم ہے۔ ایسے جامع کمالات، زبان پر زبردست قدرت رکھنے والے بےمثل ماہر کہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور اپنے ملک کے لیے عزت و افتخار کا موجب بنتے ہیں۔

ان کا سلسلہ نسب والد ماجد کی طرف سے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ (شہادت: ۲۸ ذی الحجہ ۲۳ھ/۵ نومبر، ۶۴۳ء) سے اور والدۂ ماجدہ کی طرف سے حضرت محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (یکم رمضان ۴۷۱ھ - ۹ ربیع الاخر ۵۶۱ھ/ ۷ مارچ ۱۰۷۸ء - ۱۲ فروری، ۱۱۶۵ء) رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔

ان کے اجداد تھانیسر کے باشندے تھے۔ اُن کے والد ماجد شیخ محمد بخش وہاں سے نقل مکان کر کے

---

[1] ہدایت اللہ خان ہدایت، شاگرد خواجہ درد سے مراد ہے۔

[2] ان کے مختلف تذکروں میں مختلف نام دیے ہوئے ہیں۔ میر مرتضیٰ علی خان فراق گلشن ہند ۷۸؛ میرزا مرتضیٰ قلی بیگ: تذکرہ شعرائے اردو: ۱۲۲؛ شعرائے ہندی: ۲۱۰؛ مرتضیٰ فراق: مقالات الشعرا: ۶۹

دلی کے کوچہ چیلان میں آبسے تھے۔ محمد بخش کے دو بیٹے ہوئے۔ امام بخش صہبائی اور حکیم پیر محمد بخش صہبائی، یہیں دہلی کے کوچہ چیلان میں پیدا ہوئے۔ ان کے سنہ ولادت کے بارے میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر کے مطابق، جو صہبائی کے ملنے والے تھے، ۱۸۵۴ء میں صہبائی کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔ اس کی رو سے پیدائش تقریباً ۱۷۹۵ء میں ہوئی ہوگی۔ لیکن ان کے دوست اور ہم پیشہ اور ہم مشرب مولوی کریم الدین (مؤلف طبقات الشعرائے ہند) نے ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) میں ان کی عمر ۴۰ سال بتائی ہے (اگر چہ مولوی کریم الدین سنن کے معاملے میں بہت بے احتیاط ہیں) بہر حال ''امام بخش صہبائی'' کے مصنف ڈاکٹر محمد حامد نے اپنے مقالے میں ولادت ۳-۱۸۰۲ متعین کی ہے۔

مولوی صہبائی کے دو صاحبزادے تھے۔ ایک مولوی عبدالکریم سوز[1] اور دوسرے مولوی عبدالعزیز (متوفی ۔ ۱۸۵۷) صہبائی کے بھائی پیر محمد بخش کے صاحبزادے کا نام عبدالحکیم بسمل تھا۔ تینوں اپنے دور کے مشہور شاعر تھے اور اہل علم شمار ہوئے۔

مولوی امام بخش صہبائی کا رنگ گندمی اور منہ پر کہیں کہیں چیچک کے داغ بھی تھے۔ بدن دبلا پتلا اور قد درمیانہ تھا۔ پرانی وضع کا لباس یعنی ایک برکا سفید انگرکھا، کشمیری کام کا جُبّہ اور سر پر چھوٹی سی دستار، طبیعت میں سادگی تھی لیکن وہ فضل وکمال کے اس مقام پر تھے کہ لوگ سروقد تعظیم دیتے تھے۔ علم دوست ہونے کے ساتھ ساتھ انسانیت کا بھی نمونہ تھے۔ ہندو مسلمان سب سے یکساں میل جول تھا۔ ان کے ہندو شاگردوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں تھی۔

مولوی صہبائی سے سرسید احمد خان کی دوستی اخوت کے درجے کی پہنچی ہوئی تھی چنانچہ سرسید احمد خان ''آثار الصنادید'' میں لکھتے ہیں:

> ''..........کمالات ظاہری اور جلائل باطنی اور حسن معلق اور حمائدِ اطوار میں پسندیدۂ خالق ومتبول خلائق ہیں۔ خلق نوشی آپ کا آئینہ بہار اور اوضاعِ حمیدہ آپ کے محمودِ روزگار۔ اس جزو زماں میں ایسی جامعیت کے ساتھ کم کوئی نظر سے گذرا ہے[2]''

غرض یہ کہ صدق وصفا کا مظہر تھے۔ حلم وبردباری ان کی خصوصیات طبع میں شامل تھی اور آئین شرفا کے مطابق خوش خلقی اور وضعداری معمول میں داخل تھی۔ وسیع النظر انسان اور صلح کل کے مسلک پر چلنے والے تھے۔ تمام ہندو مسلمان شاگردوں کو ایک نظر سے دیکھتے تھے۔ دیندار تھے اور مذہبی احکام کی بجا آوری میں کسی

---

[1] عبدالکریم سوز اپنے والد صہبائی اور بھائی کے ساتھ انگریز کی گولی کا نشانہ ہوئے۔ امام بخش صہبائی: ۷۲

[2] آثار الصنادید: ۲: ۱۷۶

طرح کا تساہل برداشت نہیں کرتے تھے۔

صہبائی نے عبداللہ خان علوی (قائم گنج) کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا اور ان سے عربی اور فارسی پڑھی، فارسی زبان میں کمال حاصل کیا اور عربی میں معقول استعداد بہم پہنچائی۔ شعر و سخن میں بھی وہ نام پیدا کیا کہ نوعمری میں مرزا محمد حسن قتیل فریدآبادی (۱۱۷۲-۱۲۳۳ھ/۱۷۵۹-۱۸۱۷ء) کے ہمپایہ سمجھے جانے لگے تھے۔ اس زمانے میں یہ بہت بڑی بات تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے استاد کا ان پر بہت گہرا اثر تھا، لیکن یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ ان کے علم و فضل کو نکھارنے میں اس وقت کی دلی کے علمی اور ادبی ماحول کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ انھیں مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین خان آزردہ، حکیم مومن خان مومن، حکیم آغا جان عیش، مولوی مملوک العلی نانوتوی، مرزا غالب، نواب محمد مصطفیٰ خان شیفتہ، سید غلام علی وحشت، سر سید احمد خان اور ڈاکٹر اسپرنگر وغیرہ جیسے علما و فضلا و اہل سخن کی صحبت کا شرف حاصل رہا۔ مرزا غالب اپنے تینوں معاصرین کے بارے میں کہتے ہیں:[1]

مومن و نیّر و صہبائی و علوی وانگاہ حسرتی و شرف و آزردہ بود اعظم شان

صہبائی نے زندگی کی ابتدا معلّمی سے کی تھی۔ امیروں کے بچوں کو پڑھا کر اپنا پیٹ پالتے تھے۔ بعد میں یہ دلی کالج میں فارسی کے مدرس بھی مقرر ہو گئے تھے۔ یہ فارسی کے مدرس کیسے مقرر ہوئے، یہ قصہ بھی اپنے آپ میں دلچسپی سے خالی نہیں ہے:

دلی کالج میں مولوی مملوک العلی نانوتوی عربی کے میر مدرس تھے، لیکن فارسی کی تعلیم کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔ جب ۱۸۴۰ء میں حکومت ہند کے سکتر جیمس ٹامسن صاحب (جو بعد کو صوبہ غرب و شمال کے لفٹنٹ گورنر ہو گئے تھے) دلی کالج کا معائنہ کرنے کو تشریف لائے، تو انھوں نے فرمایا کہ جس طرح عربی کی تعلیم کے لیے ایک قابل مولوی صاحب موجود ہیں، اسی طرح فارسی کے لیے بھی ایک فاضل مدرس کا انتظام ہونا چاہیے۔ مفتی صدرالدین آزردہ بھی معائنے کے وقت ان کے ساتھ تھے۔ انھوں نے کہا کہ دلی میں تین صاحب فارسی کے استاد ہیں: مرزا اسداللہ خان غالب، حکیم مومن خان مومن، اور شیخ امام بخش صہبائی۔

ٹامسن صاحب نے پہلے مرزا کو بلوا بھیجا۔ یہ اگلے دن پالکی میں سوار ہو کر بنگلے پر پہنچے اور دروازے پر کھڑے لگے انتظار کرنے کہ ابھی کوئی صاحب استقبال کو آتے ہیں۔ جب کسی نے باہر آ کے ان سے کہا کہ حضرت! تشریف لائیے، تو کہا کہ کوئی صاحب آگے سے لینے کو آئے تو اتروں۔ یہ گفتگو سن کر ٹامسن خود باہر نکل آئے اور کہا کہ چوں کہ آپ رسمی ملاقات کے لیے نہیں، بلکہ ملازمت کے لیے آئے ہیں، اس لیے کوئی

---

[1] امام بخش صہبائی۔ شخصیت، شاعر، شارح: ۹۰

پذیرائی کو حاضر نہ ہوگا! مرزا بولے "ملازمت اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے میری عزو وقار میں اضافہ ہو، نہ کہ اس لیے جو پہلے سے ہے اس میں بھی کمی آجائے۔ اگر ملازمت کے معنی موجودہ رتبے میں بھی کمی کے ہیں، تو ایسی ملازمت کو میرا دور ہی سے سلام ہے" کہاروں کو حکم دیا کہ لوٹ چلو[1]۔

اس پر ٹامسن صاحب نے حکیم مومن خان کو بلوایا۔ یہ پہنچے۔ جب تنخواہ کی بات چلی تو کہا کہ مولوی مملوک العلی صدر مدرس عربی سو روپیہ مہینا پاتے ہیں، میں اس سے کم قبول نہیں کرونگا۔ غرض یہ بھی انکار کر کے چلے آئے۔

صہبائی کا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا، انھوں نے چالیس قبول کر لیے، بعد کو ترقی ہوئی تو پچاس کر دیے گئے۔ وقت کے ساتھ تنخواہ اور رتبے دونوں میں اضافہ ہوا۔ آخر میں مدرس اول کے عہدے پر سرفراز کیے گئے اور مشاہرہ سو روپے ہو گیا[2]۔

اُن دنوں مشاعروں کا عام چرچا تھا۔ جس کی بنیاد سراج الدین خان آرزو (م: ۱۱۶۹ھ/ ۱۷۷۵ء) نے ڈالی تھی۔ قلعہ معلیٰ سے لے کر دلی کالج تک ہر جگہ مشاعرے ہوتے تھے۔ ان میں اساتذہ وقت ذوق، غالب، آزردہ اور شاہ نصیر جیسے اہل سخن کا اجتماع ہوتا۔ ان اساتذہ کے یکجا ہونے سے جو سماں بندھتا ہوگا، اس کا صرف تصور کیا جاسکتا ہے۔ مولانا صہبائی بھی ان تمام نشستوں میں شریک ہوتے تھے۔

صہبائی اگرچہ فارسی کے شاعر تھے اور خود اردو میں بہت کم کہتے تھے، اس کے باوجود وہ اپنے بیسیوں شاگردوں کے اردو کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ علما کے علاوہ بہت سے ادیبوں اور شعرا نے ان کے سامنے زانوے ادب تہ کیا۔ قلعہ معلیٰ کے اکثر شاہزادے اور متوسلین ان سے اصلاح لیتے تھے۔ مذہب کی کوئی قید نہ ہونے کی وجہ سے ان کے شاگردوں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ مثلاً منشی عبدالرزاق اثر، لالہ جگل کشور اوج دہلوی، نواب امیر حسن خان بسمل کلکتوی، پنڈت گوری شنکر بلبل لاہوری، منولال حسرت، حافظ عبدالرحمٰن حسرت جھنجھانوی، منارام شرر، عزت سنگھ عیش، عنایت اللہ شوق فرید آبادی، پنڈت لالجی پرشاد فغاں، سلطان خان قلق، پنڈت اجودھیا پرشاد مبتلا، بلدیو سنگھ نامی، ان کے بہت سے شاگردوں میں سے چند کے نام ہیں۔

کثیر المشاغل ہونے کے باوجود وہ تصنیف و تالیف میں بھی بہت سرگرم رہے۔ انھوں نے فارسی میں بڑی تعداد میں کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔

ان کا فارسی دیوان ساٹھ غزلوں، چھ قصیدوں، گیارہ رباعیوں اور ایک مخمس پر مشتمل ہے اس میں

۱۔ ذکر غالب: ۸۸-۸۹ (یہ قصہ آب حیات: ص/ ۴۸۷ اور یادگار غالب ص/ ۲۶ میں بھی درج ہے۔

۲۔ ذکر غالب: ۸۸-۸۹

۶۴ صفحے ہیں اور شعروں کی تعداد ۹۵۴ ہے۔ ۱۸۸۷ء میں نول کشور پریس نے شائع کیا تھا۔ کم وبیش اتنے ہی
اشعار ان کی نثر کی کتابوں میں ملتے ہیں جو انھوں نے بطور مثال پیش کیے ہیں۔

طرز کلام کی بنا پر غالب نے شعرا کو تین گروہوں میں تقسیم کیا تھا۔ یہ گروہ تھے، گروہ خاقانی، گروہ
ظہوری اور گروہ صائب۔ غالب کی طبقہ بندی کے مطابق، صہبائی دوسرے گروہ میں آتے ہیں، جس کا علم بردار
ظہوری ہے۔

صہبائی کی شاعری میں فن کا پوار پورا التزام ہوتا ہے۔ وہ جدت اور ادا کے ساتھ متفرق صنعتوں سے
کلام میں تازگی لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں تنوع ہوتا ہے۔ انھوں نے غزل، قصیدہ، مثنوی،
رباعی، مخمس، قطعات وغیرہ کہے ہیں، جن میں سب جگہ ان کی علمیت اور قدرتِ فن کا اظہار ہوتا ہے۔

شاعری کے علاوہ صہبائی نے فارسی نثر نگاری میں بھی اپنے جوہر دکھاے ہیں اور ہر قسم کے مضامین
پر قلم فرسائی کی ہے۔ نازک خیالی، معنی آفرینی اور رنگین بیانی کا رنگ ان کی فارسی عبارت میں صاف جھلکتا ہے
اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ صہبائی کو تشبیہ در تشبیہ، استعارہ در استعارہ اور خیال در خیال کو عبارت میں استعمال
کرنے میں کمال مہارت حاصل تھی۔ ان کی فارسی تصانیف کی تعداد ۳۰ کے قریب بیٹھتی ہے۔

ان کے فارسی کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

یارب آن کن بجنون دل دیوانہ ما — کہ شود بال پری نالہ مستانہ
حسن بر خود غلط و عشق نظر باز غیور — شمع داغ است، خود داری پروانہ
ہستی اہل فنا وقف شتاب دگر است — رفتن رنگ بود. شمع بکاشانہ ما
منکر کفر مشوگر سرایماں داری — کعبہ یک پارہ سنگ است زبتخانہ ما

☆☆☆

کن آشنائی لب دوسہ حرف عتاب را — از بہر ما دو آتشہ ساز این شراب را
رنگ زخم چوگل پر پرواز می زند — دارم خزاں رسیدہ بہار شباب را
وارد اثر زچین زبیں موج خندہ ات — یکرنگ کردہ ناز تو لطف و عتاب را
چوں شمع آرمیدن عمر است اضطراب — دارد سرد رنگ بہارم شباب را
وحدت ہزار جلوہ نتادہ است دیدہ ام
دردیر کعبہ رنگ عذاب ثواب را

۱

یارب آنکہ توای جان منی ہمدم شان گر تمہ نوش دہد لعل تو گردد سم شان
زاہدان بین کہ نکشتند حریف می عشق وہ چہ قوم اند کہ گفتند نتوان آدم شان
جام کوثر زن و خاک رہ بت مال بلب آواز آنان کہ وضو نام بر آرد نم شان
شاہدان بین کہ چہ شوخند کہ چون شمع بزم باشد آرام از ایشان تمہ طرزِ رم شان
منگر ہمت آن جمع کہ یک گام سفر افگند تشنہ لب از بادیہ بر زمزم شان
یاد روز یکہ بہ بیداد بتان کار نبود خاطر از وسوسہ خالی بدو دل از غم شان
دل جدامی تپد از غم جگر از درد جدا کی دہد دست کہ فارغ شوم از ماتم شان
نالۂ غالب و آزردہ زکف برد عنان سوختم سوختم از آتش گرم دم شان
از بتان لطف وگر جور بکش صہبائی
ساز گار است اگر نوش بود گرسم شان

☆☆☆

۲

چہ از دست دل ناکام مارفت کہ دل از سینۂ و آرام مارفت
چو جام عمر می از نامرادی! ہمین تا گشت پُر از جام مارفت
رفیقی در سفر چون نقش پا کیست کہ باما بود ہر جا گام مارفت
زسیش شوق ما راضی نمی شد ز قاصد بیشتر پیغام مارفت
بتن خون نذر تینش را کجا بود جگر خون گشت و از اندام مارفت
ز تیجرت ور اگر در روز ما نیست زیادت تیرگی از شام مارفت
چہ شد گر چون نگین بر جای ماندیم در اطراف دو عالم نام مارفت
بمین بس کر پس صد امتحان گفت
چہ بر صہبائی ناکام مارفت!

☆☆☆

۱۔ دیوانِ صہبائی، ص ۳۷

۲۔ دیوانِ صہبائی، ص ۲۰

امراؤ سنگھ عزیزؔ سونی پتی

سونی پت کے رہنے والے تھے جو دہلی کے مضافات میں ہے۔ انھوں نے انگریزی زبان کی تعلیم سر کاری مدرسے میں پائی۔ فارسی اور علم عروض وغیرہ مولوی جعفر علی سے سیکھا۔ فن شعر میں بھی انھیں کے شاگرد تھے۔ اردو اور فارسی، دونوں میں کہتے تھے۔ فارسی کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

چشم بت سرگین خدارا خیر مست را تیغداری بینم
حسرت ویاس ِ وصل جانان را زیر سنگِ مزاری بینم

برکت علی کشتہؔ بہادر گڈھی

یہ بہادر گڈھ، ضلع رہتک کے رہنے والے تھے۔ وہیں کے مدرسے میں تعلیم پائی۔ بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ جب یہ دلی میں پڑھتے تھے تو اکثر وہاں کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ مولوی سیف الحق ادیبؔ دہلوی کے شاگرد تھے قد، متوسط، سانولا رنگ اور تند مزاج تھے۔ ابتدائے مشق میں اکثر لوگوں کی ہجو کرتے تھے اردو فارسی دونوں میں کہتے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

ناصح مجل مساز زبی آبروئیم آخر بگو بہ عشق بتاں عزو جاہ کیست
باشدنہ بیخبر چو منی ہیچکس بدہر جان ودلم ربود ندانم نگاہ کیست

پیر محمد فزونیؔ کرنالی[1]

پیر محمد فزونیؔ دراصل سبزوار کے رہنے والے تھے، جو مشہد (ایران) کے غرب میں واقع ہے وہاں سے ہندوستان آئے اور کرنال میں مقیم ہو گئے۔ یہاں ان کے ہاتھوں کسی کا خون ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے ان کو ہندوستان چھوڑ کر واپس اصفہان (ایران) جانا پڑا۔

ان کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

---

[1] میر: روز روشن: ۵۲۹

مشتاقم آن چنان کہ پس از مرگ میرسد
بی منتِ نسیم بکویش غبار ما

☆☆☆

باز آکہ دیدہ ہا برہِ انتظار تو
امیدوار از مژہ بیرون نشستہ اند

☆☆☆

چند از طپیدن ِ دلِ اندوہگین خویش
خجلت برم ز پہلوی پہلو نشین خویش
ہرگہ بکویت آمدہ ام ، آفتاب را
خنجر کشیدہ یافتہ ام در کمین خویش

میر جعفر زٹلؔ نارنولی

میر جعفر زٹل (۱۰۶۵ھ-۱۱۲۵ھ/۱۶۸۶ء-۱۷۴۶ء) اپنے زمانے میں ہندوستان کے سب سے مشہور ہزل گو شاعر ہوئے ہیں۔ وہ ہزل و ہجو گوئی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

میر جعفر زٹل نارنول میں پیدا ہوئے۔ وہ سید عباس کے بیٹے تھے جو نارنول میں دکانداری کرتے تھے۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی (۱۶۵۸ء) اور میر جعفر کی ولادت ایک ہی سال کے واقعے ہیں۔ ان سے بڑی دو بہنیں تھیں اور ایک چھوٹا بھائی صفدر۔ میر ابھی چھوٹے ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ ان کے چچا میر سرور نے ان کی سر پرستی کی۔ مکتب میں تعلیم پانے کے بعد ملازمت کی تلاش میں نکلے اور شاہزادہ کام بخش (۱۷۰۸-۱۶۶۷) (ابن اورنگ زیب عالمگیر) کی فوج میں سواروں میں ملازم ہو گئے۔

ان کی زبان بہت ہی تیکھی تھی۔ شریف اور عزت دار آدمی ان سے اپنا دامن بچا کر چلتے تھے اور کچھ نہ کچھ دے کر ان کا منھ بند رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا عام طریقہ یہ تھا کہ جب کسی کے گھر جاتے تو ایک کاغذ پر صاحبِ مکان کی تعریف لکھی ہوتی اور دوسرے پر ہجو۔ اگر ان کا مطلب پورا ہو جاتا تو تعریف کا کاغذ نکال کر پڑھ دیتے اور اگر کہیں معاملہ اس کے برعکس ہوتا تو ہجو کا کاغذ صاحبِ مکان کے ہاتھ میں تھما کر اپنی راہ لیتے۔ اس معاملے میں وہ اپنے دوستوں تک کو نہیں بخشتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک دن مرزا عبدالقادر بیدلؔ (م: ۱۱۳۳ھ/ ۱۷۲۰ء) کے گھر گئے اور ان کے روبرو یہ مصرع پڑھا۔

چہ عرفی، چہ فیضی، بہ پیش تو پھش

مرزا یہ سن کر بہت خفا ہوئے اور کچھ دے دلا کر رخصت کر دیا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ میر حسن نے اپنے ''تذکرہ شعرائے اردو''[1] میں رقم کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایک بار میر جعفر مرزا عبدالقادر بیدل کے یہاں گئے مرزا اس وقت فکرِ شعر میں مشغول تھے۔ انھوں نے کچھ توجہ نہ کی۔ جعفر نے پوچھا قبلہ، وہ مصرع کیا ہے جس کے لیے دوسرے مصرع کی تلاش ہے؟ بیدل نے کہا مصرع یہ ہے ''لالہ بر سینہ داغ چوں دارد'' جعفر نے فوراً دوسرا مصرع کہا ''چو بکی سبز زیر......دارد'' بیدل یہ سن کر سکتہ میں آگئے اور حسب معمول کچھ دے کر انھیں رخصت کر دیا۔

ان کا تمام کلام ہجو اور فحش سے بھرا ہوا ہے۔ کچھ تو طبیعت کی افتاد اور کچھ ایام کی مبتذل حالت نے ان کو اس رنگ میں رنگ دیا تھا۔ ہجو انھوں نے کم لکھی ہے، تاہم ان کی زبان درازی اور بیباکی میں کوئی شک نہیں۔ بادشاہ سے لے کر رعایا تک کوئی نہیں بچا اور تو اور انھوں نے اورنگ زیب کو للّو کہہ دیا تھا۔ شاہزادہ اکبر (۱۶۵۷-۱۷۰۴) کے بارے میں لکھا۔

چہارم پسر ڈومنی کا جنا برج میں رہے جیوں......

خود اپنے محسن شاہزادہ کام بخش (ولادت: ۲۴ فروری ۱۶۶۷ء) پر بھی چھینٹا کشی کرنے سے باز نہ آئے۔ خیر اس میں گذری کے صرف نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا۔ شاہزادوں کی آپس کی رقابت کو لے کر محمد معظم (۱۷۰۷ء-۱۷۱۲ء) اور محمد اعظم شاہ کو بھی خوب لتاڑا ہے۔

باوجود اس کے میر جعفر زٹل کے نام سے مشہور ہے، ان کے کلام کو خداداد قبولیت حاصل ہوئی اورنگ زیب نے جب ۱۷۰۷ء میں وفات پائی اور اس کا لڑکا محمد معظم گدی پر بیٹھا تو سب نے سکّے کہے لیکن کوئی پسند نہیں آیا۔ جعفر نے فی الفور سکّہ پڑھا۔ پادشاہ نے خوش ہو کر جعفر کو خلعت فاخرہ سے نوازا اور ایک لاکھ روپیہ بھی دیا جو انھوں نے گھر تک پہنچتے پہنچتے راستے میں فقرا کو بانٹ دیا۔ سکّہ تھا:

نگین سلیمان کہ نامیدہ[2] بود ہمیں اسم اعظم برو[3] کندہ بود

جب فرخ سیر ۱۷۱۳ء میں تخت پر بیٹھا تو زٹل نے بڑا مضحکہ خیز سکہ کہا:

سکہ زد برگندم و موٹھ و مٹر پادشاہ طسمہ کش فرخ سیر

اس پر فرخ سیر نے زٹل کی گردن اڑوا دی۔ اس وقت ان کی عمر ۵۷ سال کی تھی۔ جعفر زٹل کا دیوان

---

[1] ص: ۴۸

[2] شورش: ۹ ۲۷ تابندہ

[3] ایضاً برآن

بھی چھپ چکا ہے۔ نمونے کے طور پر فارسی کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

من آن رستم وقت روئین تنم | کہ دہ پاپڑ از مشت خود بشکنم
کنم روزن اندر چپاتی بہ تیر | بر آرم دمار از سر مور پیر
کشم گردن پشہ رادر کمند | مگس چند را من در آرم بہ بند
بپوشم اگر جوشن جنگ را | ہزیمت دہم پشہ لنگ را
بیک حملہ بال مگس برکنم | قطار دوصد مور برہم زنم
دریں دور ثانی رستم منم | بتاسہ زگرز گران بشکنم
تہمتن منم گر کشم تیغ خشم | تراشم بیک ضرب یک موی پشم

☆☆☆

جعفر بہ بوستان جہان غم غنیمت است | شادی اگر نصیب نشد غم غنیمت است[1]

☆☆☆

شنوای طوطی روحانی من | نہ کر الفت بہ رنگین پنجرہ تن

☆☆☆

از ہجو سلطان خود کردی پریشان جان خود | درماندہ بی بال و پر کہہ اب کیسی بنی
وہ ذوق ہرزم کا کہاں وعطر بیگم کا کہاں | در خاک شد کروفر کہہ جعفر اب کیسی بنی

حضرت شیخ جمال الدین ہانسوی

ان کا سلسلہ نسب امام اعظم حضرت ابوحنیفہ پر منتہی ہوتا ہے۔ یہ شیخ فریدالدین گنج شکر (م: ۵محرم ۶۶۴ھ/۱۷کتوبر ۱۲۲۵ء) کے مرید اور خلیفہ تھے۔ گنج شکر کو ان سے اتنی محبت تھی کہ ۱۲سال ان کے پاس ہانسی میں رہے۔ ان کے بارے میں وہ فرمایا کرتے تھے..... ''جمال جمال ما است''[2]

---

[1] یہ شعر ''تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن): ۴۷'' میں یوں ہے۔

جعفر بہ بوستان جہان دم غنیمت است | شادی نصیب اگر نشود غم غنیمت است

[2] اخبار الاخیار: ۷۳

ان کی ایک کتاب ''اسلام کے دھارمک سدھانتوں کی ویاکھیا'' چھپ چکی ہے یہ اردو میں ۱۹۲۳ میں چھپی تھی۔ ہریانہ کا اتہاس: ۲: ۱۹۴

بابافرید کو جب کسی کو خلافت نامہ عطا فرمانا ہوتا تو پہلے آپ کے پاس مہر لگوانے کے لیے آتے تھے۔ اگر جمال مہر لگا دیتے تو خلافت نامہ مستند سمجھا جاتا تھا، اگر یہ رد کر دیتے تو بابا فرید بھی اس شخص کو اپنی خلافت میں قبول نہیں فرماتے تھے۔ کہتے تھے، ''پارہ کردۂ جمال را فرید نتواند دوخت جمال محمد تغلق (۱۳۲۵-۱۳۵۱ء) کے ہمعصر تھے۔

ظاہر و باطن میں اعلےٰ کمالات کے حامل تھے۔ وہ ایک اچھے خطیب بھی تھے۔ فقر و فاقہ کو تاج و تخت پر ترجیح دیتے تھے۔ علم ترک و تجرید ان کا شعار تھا۔ یہ ایک عالم بھی تھے کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے ''ملہمات'' ان کی مشہور تصنیف ہے۔ یہ عربی میں ہے۔

جمال فارسی زبان کے بھی شاعر تھے۔ نمونے کے طور پر ایک قطعہ ملاحظہ ہو

مرد را چون سپید شد سرورلیش — یا ازو مال رفت و گشت فقیر
زن بدو التفات نہ نماید — چون ببیند فقیر و مفلس پیر
بی جوانیش دوست کی دارد — بی زروسیم کی کند توقیر
چون ترا این دو چیز حادث گشت — رخت از حجرۂ زنان بر گیر

پیری و نیستی و زن بہ مراد
کم بود این سخن زمن بپذیر

حضرت گنجشکر کے بارے میں کہتے ہیں۔

آن عقل کجا کہ در کمال تو رسد — وآن درک کجا کہ در جلال تو رسد
گیرم کہ تو پردہ بر گرفتی زجمال — آن دیدہ کجا کہ بر جمال تو رسد

اولاد میں دو بیٹوں کا ذکر ملتا ہے، شیخ برہان الدین اور دانشمند۔ دانشمند دیوانے ہو گئے تھے۔ نظام الدین اولیا (وصال: ۱۸ ربیع الاول ۷۲۵ھ/۴ مارچ ۱۳۲۴) نے فرمایا ہے کہ کبھی ہوش میں آجاتے، تو بڑی ہوشیاری کی باتیں کرتے تھے۔

شیخ جمال الدین ہانسوی نے ۶۵۹ھ/۱۲۶۰ء میں وفات پائی اور ہانسی میں دفن ہوئے۔

لالہ حکیم چند ندرتؔ تھانیسری

یہ پرگنہ تھانیسیر کے قانونگو تھے[1]۔ نہایت قابل، دلچسپ اور خوش طبع، سخنوری اور لطیفہ گوئی میں معروف انسان تھے۔ آغاز شباب ہی سے بندرابن داس خوشگو (مصنف سفینہ خوشگو) اور ندرت میں باہم معنوی رابطہ پیدا ہو گیا۔ دونوں ایک ساتھ مولوی محمد عابد سے ''اخلاق ناصری'' پڑھتے تھے اور حضرت سرخوشؔ کے سامنے مشق سخن کرتے تھے۔ غرضیکہ دونوں ایک ہی گلستان کے پھول تھے۔ ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتے اور سیر و تفریح کرتے تھے، لیکن حالات کبھی موافق نہ ہوئے اور نہ ہی قابلیت کے مطابق قدر ہوئی۔ بخشی الممالک صمصام الدولہ کے یہاں ۵۰ روپئے مشاہرے پر ملازم ہو گئے اور یوں گذر بسر ہونے لگی۔

بلند طبع اور پختہ ذہن کے مالک تھے۔ تصوف سے بھی انھیں پوری واقفیت تھی۔ اپنے زمانے کے نامور شعرا جیسے مرزا بیدل، شاہ گلشن اللہ مرحوم وغیرہ کی صحبت کا شرف حاصل رہا۔

''بھاگوت گیتا'' کے دسویں باب ''دشم اسکند'' کا ''شیرین خسرو'' کی طرح ۱۴ ہزار بیت میں ترجمہ کیا۔ حضرت کرشن نے ایک مرتبہ ''گووردھن پروت'' (پہاڑ) کو انگلی پر اٹھا لیا تھا اس منظر کو یوں بیان کرتے ہیں۔

سبک برداشت آن کوہ گراں را   چو ماہ نو بر انگشت آسماں را

ایک اور مثنوی ''ذرہ و خورشید'' کہی جو دو ہزار شعروں پر مشتمل ہے۔ نواب صمصام الدولہ سے منصوب ''ساقی نامہ'' میں ۷۰۰ بیت تھے۔ اس کے علاوہ نواب صدر الصدور میر جملہ ترخان اور دیگر امرائے وقت کی مدح میں قصائد بھی لکھے ہیں۔ غزلوں کے اشعار کی تعداد پندرہ ہزار ہے۔ فارسی نثر میں بھی ان کو خوب مہارت حاصل تھی۔

ان کے اشعار میں رنگینی اور شستگی، روانی اور مضمون آفرینی برقرار رہتی ہے۔ نہ کہیں زور بیان میں کمی ہوتی ہے، نہ تاثیر میں۔ اشعار کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں۔

تا کی مقید من و مائی زخود برآ   ای بندۂ خیال خدای زخود برآ

☆☆☆

---

[1] لالہ ہردے رام قانونگو کی نسل سے تھے۔ گل رعنا: ۱۶۵

حقیقت تا مجاز آئینہ دار روی ہم باشد
مژہ بکشا چوں شمع این جا و روشن کن نگاہ آنجا

اگر دل از محبت آب گردد ، حل شود مشکل
کہ دارد بحر مہ رادر کنار اینجا وماہ آنجا

☆☆☆

سخنور در لباس فقرہم جو ہر نما باشد
نیام ذوالفقار حیدری از بوریا باشد

☆☆☆

میزند دم از مسیحا خم ز پہلوی شراب
زندہ سازد مردۂ صد سالہ رابوی شراب

☆☆☆

سوز دبہ خاک ہم زتبِ عشق تن مرا
چوں صبح آتشی است نہاں درکفن مرا

☆☆☆

گر ا زلب تشنگی چسپد زبان باکام لب مکشا
چون موجِ گوہر ، ای صاحب عباد آب طلب مکشا

☆☆☆

گلستان می شود صحرا، بود گر جام می برکف
برنگی عینک سرخی کہ درپیشِ نظر باشد
زبان در کام ورزیدن صفائی دل کند پیدا
در آن محفل کہ عیبِ یکدگر گفتن ہنر باشد

☆☆☆

شیخ خادم علی خان خادمؔ کیتھلی

شیخ خادم علی خان خادمؔ کیتھل کے باشندے تھے۔کیتھل مضافات سرہند کا قصبہ تھا اب خود ایک ضلع ہے۔ان کے چچا قادر علی خان بسبب ملازمت عماد الملک غازی الدین خان ،فرخ آباد میں سکونت پذیر ہوئے تو یہ بھی ان کے ساتھ وہیں جا رہے۔نواب احمد خان مخاطب بہ ناصر جنگ بنگش نے ان کو مظفر جنگ کا اتالیق مقرر فرمایا تھا۔

خادم شعر میں غلام محمد آزاد کے شاگرد اور اردو- فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔فارسی دیوان ان سے یادگار ہے۔

''سخن شعرا'' میں آیا ہے کہ خادم میر تقی میرؔ کے شاگرد تھے اور دلی میں تربیت پائی۔بیشتر خطوط میں دخل رکھتے تھے۔صاحب دیوان ہو گزرے ہیں۔کلام کا نمونہ نہ مل سکا۔

منشی درگا پرشاد نشاطؔ تھانیسری

منشی درگا پرشاد نشاط قوم کے کایستھ تھے۔یہ بہت موزوں صبع ،لطیف المزاج اور نکتہ سنج تھے۔منشی فدا حسین غریق نے ان کے ذکر میں لکھا ہے کہ نشاط کے والد وکیل تھے اور ان کا وطن غریق تھا۔انگریزی سرکار نے نشاط کو پہلے تو تھانیسر کا تحصلیدار اور پھر انبالہ کا سررشتہ دار مقرر کیا۔فارسی میں شعر کہتے تھے ان کے چند فارسی اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

جوش باراں نگر و لطف ہوا را دریاب
جرعۂ لطف کن و حسرت مارا دریاب

دروطن باش وغم جان غریباں میخور
بادشاہی کن و تشویش گدارا دریاب

ہمہ تن کاہش جانیم بجان تو قسم
ہمہ چشم نگرانیم نگارا دریاب

شاعران نسبت رخسار تو داد ند بمہر
رفعت طالع آن بی سرو پارا دریاب
چارہ حکم قضا جزبہ رضا نیست دگر
امر مجبوری اسکندر و دارا دریاب

رائے رام جی ہاتفؔ انبالوی

رائے رام جی نام وہاتفؔ تخلص یہ قصبہ انبالہ کے رہنے والے تھےاور قوم کے کھتری تھے۔ بہت ہی باادب اور بااخلاق آدمی تھے رسائل حقایق ومعارف کا مطالعہ کیااور علم شعروانشاوتواریخ وسیاق سے بھی استفادہ کیا۔فرخ سیر (۱۷۱۳-۱۷۱۹ء) کے عہد کے شروع میں نائب دیوان تھے۔پھرامیرالامراصمصام خان دوران بہادر عرف خواجہ عاصم کے یہاں میر سامانی کے عہدے پر مامور ہوئے جو کچھ ملتا تھا اسے خوش ہو کر قبول کرتے اور خدا کی راہ میں صرف کردیتے تھےاور دینی اور دنیاوی سعادت کا ذخیرہ جمع کرتے تھے۔

تذکرہ ہمیشہ بہار کے مصنف کشن چنداخلاص اور ہاتف ایک دبستان کے تعلیم یافتہ ہیں، لیکن اول الذکر کا کہنا ہے کہ وہ مجھ سے (اخلاص سے) کہیں آگے تھے کبھی کبھی فارسی شعر کہنے میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ فارسی اشعار کے نمونے نہ مل سکے۔

رشیدالدین فائزؔ نارنولی

نام محمد رشیدالدین اور تخلص فائزؔ تھا۔ پہلے کچھ دن منتظرؔ تخلص کیا۔ان کے والد کا نام اصلاح الدین تھا۔

نارنول میں ۱۲۲۲ھ (۱۸۰۷ء) میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم گھر پر بزرگوں سے پائی۔۱۲ سال کے تھے کہ درس نظامی کی تکمیل کرکے دستار فضیلت حاصل کی، لیکن علم کا شوق دلی لے گیا جہاں کئی برس تک مشہور و متبحر علما وفضلا کی خدمات میں رہ کر معقولات ومنقولات کی تکمیل کی اور یوں سیرابی ذوق علم کے بعد وطن مالوف واپس آگئے۔

دلی سے واپسی کے بعد کچھ عرصے تک طلبا کو پڑھاتے رہے۔پھرنواب عبدالرحمٰن خان والی جھجر نے

شاہی خاندان کے افراد کی تعلیم کے لیے انھیں جھجر بلوایا۔ لیکن کسی بات پر نواب صاحب سے اختلاف ہوگیا اور وہ ملازمت ترک کر کے واپس چلے گئے[1]۔

۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) میں اورینٹل کالج جے پور میں مدرس اول مقرر ہوئے اور بقیہ عمر وہاں طلبا کو عربی اور فارسی کی تعلیم دینے میں بسر کردی۔ یکم ربیع الاول ۱۳۰۴ (۲۸ نومبر ۱۸۸۶ء) کو انتقال کیا۔

ان کے شاگردوں میں مولانا تسلیم، مولانا مبین، منشی، مونس، ہاتفی نے شہرت پائی۔ سب ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ افسوس ان کی بہت سی تصانیف نذر آتش ہوگئی تھیں۔ ان میں ایک کلیات فارسی بھی تھی۔ ان کی ایک فارسی تصنیف ''ریاض رنگین'' ۱۸۶۴ء میں شایع ہوئی تھی۔

معلوم نہیں ہوسکا کہ فارسی شاعری کا شوق کیسے پیدا ہوا اور کس سے تلمذ تھا۔ کلام کے نمونے میں یہی اشعار ملے ہیں۔

ترانہ سنجی بلبل بوی گل زیباست　　بنظم بزم چمن اہتمام باد صباست

کہ لالہ جام عقیقیں صنو برش میناست　　سبو سبو نکشد چوں می دوآتشہ گل

چونیم مست اشاراتِ نرگس شہلاست　　ہنوز در طلب یک دو ساغر دیگر

مگر ہبوبِ نسیم سحر دم عیسی است　　دمیدہ روح نباتی بسبزہ زارِ چمن

نگار خانہ فصل ربیع صنعِ خداست　　بصحن باغ زِ گلہا طراز رنگا رنگ

سعد اللہ مسیحا پانی پتی

سعد اللہ مسیحا یا مسیح حکیم مقرب خان (شیخ حسن) کے متبنّٰی بیٹے تھے۔ مقرب خان جہانگیر کا طبیب بھی تھا اور دوست بھی، بعد میں وہ بیہار، گجرات اور آگرہ کا صوبیدار بھی مقرر ہوا۔ جہانگیر نے تزک جہانگیری میں متعدد جگہ مقرب خان کا ذکر کیا ہے۔

مسیحا کا اپنے زمانے کے ممتاز شعرا میں شمار ہوتا ہے مُلا شیدا فتحپوری کے بارے میں لکھتا ہے۔

در من وشیدا نماند اندر حقیقت امتیاز

من بہ شیدا مانم و ماند بمن شیدای من

مسیحائی کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ ہندی زبان سے رامائن کا فارسی میں منظوم ترجمہ ہے۔ یہ

---

[1] تاریخ جھجر میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

"حدیث رام اور سیتا" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں صوفی شیخ محمد باقی یا الباقی کی بھی تعریف میں لکھا گیا ہے۔ یہ تصنیف جہانگیر کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ ان کی نعت میں رباعی کا ایک شعر ملاحظہ ہو جسے شعرا نے بہت پسند کیا ہے۔

دل از عشق محمد ریش دارم
رقابت با خدای خویش دارم

سیتا کی عصمت کی تعریف میں ایک رباعی کہی ہے جسے پڑھکر تمام نیک خیالات دانتوں تلے انگلی دبا لیتے ہیں اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

تنش را پیراہن عریاں ندیدہ
چو جان اندر تن و تن جان ندیدہ

محمد علی ماہر[1] نے اس شعر پر کہا تھا، "اے کاش! اب تک میں نے جتنے بھی اشعار کہے ہیں وہ سب اس کے نام منسوب ہو جائیں اور یہ ایک شعر میرے نام منسوب ہو جائے"۔

سیتا کے زمین میں سما جانے کا منظر انھوں نے یوں بیان کیا ہے۔

کنم من سر فدای نام سیتا چہ یکتا سر چہ دہ تا سر چہ سی تا
گریبان زمین شد ناگہان چاک درآمد ہمچو جان دو قالب خاک

فارسی کلام کے کچھ اور نمونے دیکھیے۔

دربزم عاشقان چو بر آرم ز سینہ[4] آہ چون ہیزمی کہ دود کند[2] دورم[3] افگند
گراز خراش دلم منکری بہ بین بی رحم کہ پوست کندہ[5] سخن میکند ادا ناخن

حکیم مقرب خان کو ایک رباعی لکھی تھی جس کا شعر دوم یہ ہے۔

---

[1] داراشکوہ (۱۶۱۵ء–۱۶۵۹ء) کے دور میں فارسی شاعر ہو گذرے ہیں یہ مرزا جعفر نعمانی کے ہاتھوں مسلمان ہوئے۔ کلمات الشعرا کے مصنف سرخوش (۱۶۴۱–۱۷۱۴ء) کے استاد تھے۔ ماہر نے ۱۶۷۸ء میں انتقال کیا: روز روشن: ۴: ۶۰۰

[2] کند: روز روشن: ۶۲۸

[3] دور: مجمع النفائس: ۴: ۷

[4] برخم: مجمع النفائس: ۴: ۷

[5] کہ پوست کند وسخن میکند ادا ناخن: مجمع: مجمع النفائس: ۴: ۷

بر خوان عطائی تو مسیحا محروم چون صورت تصوّر[1] ہر کہ باشد بر خواں

ان کی ایک اور تصنیف ''پیغام نامہ'' ہے یہ حضرت رسول اللہ صلعم کی منظوم سوانح عمری ہے۔

رامائن کے قلمی نسخے:

بانکی پور: ۳۳۱-۳۳۲؛ مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ: ۴۲؛ آصفیہ لائبریری: ۱۶۷۸؛ برٹش میوزیم، لندن: ۶۸۹، ۱۰۷۸؛ انڈیا آفس لائبریری: ۱۳۱۵۔

''پیغام نامہ'' کا قلمی نسخہ:

برٹش میوزیم، لندن: ۱۰۷۸

سکندر علی خان فغاں بھوانی

فغاں فارسی کے شاعر تھے۔ زانوے تلمذ ذوق (۱۷۷۹-۱۸۵۴ء) کے سامنے تہ کیا ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۸ء) میں بھوانی[2]، ضلع حصار میں مدرس تھے۔ ان کے تفصیلی حالات دستیاب نہ ہو سکے۔

شاہ اللہ پانی پتی

ان کا اصلی نام عبدالسلام تھا۔ یہ شیخ نظام الدین پانی پتی کے فرزند تھے۔ شاہ اللہ بعد میں شیخ نظام الدین نارنولی (متوفی: ۹۹۷ھ/۱۵۸۸ء) کے مرید ہو گئے تھے۔ شاہ اللہ ۱۴۲ سال کی عمر میں پانی پت لوٹے۔

''سیر الاقطاب'' ان کی تصنیف ہے جو انھوں نے (۱۰۳۶-۱۰۵۶ھ/۱۶۲۶-۱۶۴۶ء) کے دوران تالیف کی تھی۔ اس کا قلمی نسخہ (OR۲۱۴) برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے۔ یہ فارسی شاعر تھے۔ ان کے کلام کا نمونہ نہ مل سکا۔

---

[1] تصویر: روز روشن: ۶۲۸۔

[2] اب بھوانی خود ایک ضلع ہے۔

مرزا شجاع الدین خان تاباں لوہارو

شجاع الدین احمد خان تاباں نے شعر وادب کا ذوق میراث میں پایا تھا۔ وہ نواب ضیا الدین خان نیر رخشاں (۱۸۲۱-۱۸۸۵ء) کے بڑے صاحبزادے تھے۔

تاباں بڑے عجیب وغریب قسم کے آدمی تھے۔ کچھ وظیفہ لوہارو اور حیدر آباد کی ریاستوں سے مل جاتا تھا، کچھ آمدنی جدی جایداد سے ہو جاتی تھی، اس لیے فکر معاش سے آزاد تھے۔ ان کا بیشتر وقت شعر وشاعری اور شطرنج میں گزرتا تھا۔ حکیم محمد اجمل خان، حکیم عبدالمجید خان، نواب فیض احمد خان، خواجہ عبدالمجید اور پنڈت امرناتھ ساحران کے دوستوں میں سے تھے۔ انھیں کے ساتھ یا شعر وشاعری کی محفل گرم رہتی یا شطرنج کا دور چلتا رہتا۔ طبیعت اتنی سادہ اور دردمند پائی تھی کہ ضرورتمند کو تن کے کپڑے تک اتار کر دے دیتے۔ دوسری طرف غصہ وراتنے کہ حکیم محمد اجمل خان تک کو نہیں بخشتے تھے۔

تاباں کی شادی باقر علی خان کامل (۱۸۴۷-۱۸۷۶ء) کی بڑی صاحبزادی محمد سلطان[1] عرف ننھو بیگم سے ہوئی تھی۔ مرزا غالب اسے پیار سے مرزا جیون بیگ کہا کرتے تھے۔ تاباں کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ وفات ۱۹۲۶ء میں ہوئی اور اپنی خاندانی ہرواڑ مرزا بابر، قطب صاحب میں دفن کیے گئے۔

تاباں نے اپنے کلام پر حسین علی خان شادان (متوفی یکم شوال ۱۲۹۶ھ/۷ ستمبر ۱۸۸۰ء) سے اصلاح لی۔

تاباں کے لیے فارسی زبان بمنزلہ مادری زبان کے تھی۔ نمونے کے طور پر چند شعر درج ذیل ہیں۔

تا کی وزد نسیم ، سر لالہ زار ما — اکنون دمد بہ شاخ گلِ نو بہار ما
یارب بہ علم وفضل گر آید امین دین — یکتا ی روزگار شود شہر یار ما
تاباں زباں کشود ترا شہر یار گفت — فخر زماں و فخر زمن افتخار ما

---

[1] ولادت ۱۸۶۵ء۔

شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی

شرف الدین ان کا نام اور بوعلی قلندر کنیت ہے۔ان کے زیادہ حالات تو معلوم نہیں ہو سکے، لیکن دستیاب معلومات سے پتا چلتا ہے کہ وہ ۶۰۵ھ[1] (۱۲۰۸ء) میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ان کے والد فخر الدین عراق سے ہندوستان تشریف لائے اور بہاء الدین زکریا ملتانی (۵۶۶-۶۶۶ھ/۱۱۷۰-۱۲۶۷ء) کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔ان کی والدہ بی بی جمال، سید نعمت اللہ ہمدانی کی ہمشیرہ تھیں۔(بعض لوگوں نے ان کی والدہ کا نام بی بی حافظہ لکھا ہے)

انھوں نے اپنی تصنیف ''حکمت نامہ'' میں اپنے بارے میں جو کچھ مختصر لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۴۰ برس کی عمر میں اپنے وطن پانی پت سے چل کر دلی پہنچے، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کا کی (وفات ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ/۲۷ نومبر ۱۲۳۵ء) کے روضہ کا طواف کیا، حکیم علیم کے مدرسے سے کتابی علم حاصل کیا اور بعد تکمیل وہیں مشغول تدریس ہو گئے، اسی کے ساتھ فتویٰ نویسی کا کام بھی ان کے سپرد ہوا۔اسی باعث اس وقت کے دلی کے بیشتر علما ان کے خلاف ہو گئے۔لیکن اسی عہد کے دوسرے نامور علما (مولانا قطب الدین مکی، مولانا وجیہ الدین پائلی، قاضی ظہور الدین بجواری، قاضی حمید الدین، مولانا ناصر الدین، مولانا فخرا لدین نافلہ، مولانا صدر الدین، مولانا احمد بخاری، مولانا نجیب الدین سمرقندی وغیرہ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔لیکن وہ مخالفوں اور حریفوں کے درمیان پریشان ہو گئے۔جب کسی طرح اطمینان نہ ہوا تو تدریس اور فتویٰ نویسی کے کام کو خیر باد کہہ کر تصوف کی طرف مائل ہو گئے اور سفر کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔سفر کے دوران شیخ شمس الدین تبریزی (متوفی ۶۴۵ھ/۱۲۴۷ء) اور مولانا جلال الدین رومی (متوفی ۶۷۲ھ/۱۲۷۳ء) سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا[2]۔دونوں سے خرقہ خلافت بھی ملا۔سفر سے لوٹے تو جذبہ اس قدر طاری ہوا کہ دکان شیخی میں جو کچھ پونجی تھی، تمام جمنا کے پانی میں بہادی۔اپنے وطن پانی پت لوٹ آئے اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔بات چیت کرنا تو دور کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے تک نہیں تھے، اور اگر کبھی دیکھا بھی تو وہ جل کر خاک ہو گیا۔

شرف زعشق تو گشت آن قلندر سرمست   کہ جملہ مدعیان از مہا بتش مردند

---

[1] بیاض: ۱۳: ۶۰۵ء (۱۲۰۸ء) میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔دی فارگوٹن ڈریمز: ۷۰؛ عراق میں پیدا ہوئے تھے۔

[2] بیاض: ۱۴: بوعلی قلندر کبھی ہندوستان سے باہر نہیں گئے۔

جہاں بوعلی قلندر کو قطب الدین بختیار کاکیؒ (م: ۶۳۳ھ/۱۲۳۵ء) اور حضرت نظام الدین اولیا (م: ۷۲۵ھ/۱۳۲۴ء) سے عقیدت تھی، وہاں ان کے ہمعصر خلجی اور تغلق سلاطین اور فرمانروایان جلال الدین خلجی (۱۲۸۸-۱۲۹۵ء)، علاء الدین خلجی (۱۲۹۵-۱۳۱۶ء)، غیاث الدین تغلق شاہ (۱۳۲۱-۱۳۲۵ء) اور ان کی سپاہ اور اولاد ان کے مرید تھے۔ غیاث الدین تغلق سے ان کو خاص محبت تھی۔ یہ نہ درباری شاعر تھے، نہ کسی کے مدّاح، اس کے باوجود غیاث الدین تغلق کی مدح میں ان کا ایک بہت ہی عمدہ قصیدہ ہے۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے بوعلی قلندر ہندوستان میں پیدا ہوئے، لیکن وہ خراسانی کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے، بلکہ انھیں اس بات کا افسوس تھا کہ وہ ہندوستان میں کیوں پیدا ہوئے۔[1]

شمس الدین ترک پانی پتی کے پانی پت میں تشریف لانے پر، قلندر پانی پت سے ''باگوتی'' چلے گئے اور ''بڈھا کھیڑا'' میں جا کر رہنے لگے۔

۱۲۰ برس کی عمر میں رمضان المبارک ۷۲۴ھ (۳ ستمبر ۱۳۲۴ء) کو اس جہان فانی سے رحلت فرمائی۔ پانی پت میں دفن ہیں۔ ان کی خانقاہ مرجع خواص وعوام ہے۔

بوعلی شرف ایک مجذوب، صوفی اور مست قلندر ہی نہیں، بلکہ ایک عالم، فاضل، مصنف اور شاعر بھی تھے۔ ان کی مندرجہ ذیل تصانیف دستیاب ہیں۔

مکتوبات (اختیار الدین کے نام) (یہ تین جلدوں میں چھپ چکے ہیں)۔ جملہ خطوں کی تعداد ۲۷۵ خطوط ہیں۔ روایت ہے کہ یہ خطوط ابوالفضل (م: ۱۵۹۵ء) نے جمع کیے تھے۔[2]

حکمتنامہ شیخ بوعلی قلندر

''مثنوی کنز الاصرار'' اور رسالہ عشقیہ

کلیات۔

کنز الاصرار ایک منظوم حکایت ہے اور رسالہ عشقیہ میں ۳۶۲ بیت ہیں۔ کلیات میں قصائد، غزلوں اور رباعیوں کے ۱۷۰۰ اشعار ہیں۔ ان کی تصانیف، علوم عقلی اور نقلی پر مشتمل ہیں اور حلقہ صوفیہ میں معروف اور مقبول ہیں۔ انھوں نے ایک جگہ اپنے کلام کو خاقانی (۵۲۰-۵۹۵ھ/۱۱۲۶-۱۱۹۸ء) اور نظامی گنجوی (۵۳۵-۵۹۹ھ/۱۱۴۰-۱۲۰۲ء) سے بھی بہتر بتایا ہے فرماتے ہیں:

---

[1] بیاض: ۱۵: اس سے کم سے کم یہ بات تو صاف ہو جاتی ہے کہ بوعلی قلندر، عراق میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔

[2] ہریانہ کا اتہاس: ۳: ۱۶۴

شرف درپردہ رویت کلام قدس آوردہ
نہ چون شعر نظامی دان ، نہ چون اشعار خاقانی

شعرائے مقدم کی تقلید پر فخر کرتے ہیں:

جمال و ساوجی و من برادریم ہم
ہمان قدر کہ بود جامگی مناسب برد
کردم متابعت بہ ظہیر آنکہ گفت او
شرح غم تو لذت شادی بہ جاں دہد

وہ اصطلاحات جو اہل تصوف اور علما کے یہاں عام طور پر استعمال ہوتی ہیں، بوعلی کی مثنویوں میں بھی مفصل بیان ہے خود ہی سوال کرتے ہیں اور خود ہی جواب دیتے ہیں۔ بوعلی قلندر کی مثنوی پر رومی کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔ بقول شعیب اعظمی صاحب ''بوعلی کی مثنوی پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولوی کی مثنوی پڑھی جارہی ہے'' کلام کا کچھ نمونہ درج ذیل ہے:

عشق می داند ہمہ بازی و ہیچ
غیر عشق آخر چہ باشد، ہیچ ہیچ
عشق شور انگیز باشد در جہان
ہیچ شی ازوی نمی یابد امان
عشق اصطر لاب آمد در جہان
او خبر دارد ز خورشید نہان
چیست اسرار نہاں؟ عشقست وبس
کی شناسد عشق را ہر بو الہوس
عشق چون مستی کند ای ہوشیار
صد ہزاران می کشد در پای دار

☆☆☆

یار رامی بینی تو در ہر آئینہ
سوز و ساز اوست در ہر طنطنہ
ہر چہ بینی در حقیقت جملہ اوست
شمع و گل ، پروانہ و بلبل از وست

هرچه آید در نظر از جزو کل
بوم و صحرا، بلبل و بستان و گل
مرغ و ماہی ، مار و مور و خیر و شر
چشمہ حیوان و باران برق وبر
ہر چہ باشد آب و آتش ، باد و خاک
جملہ را مخلوق کرد از صنع پاک
گوہر جاں مطلعِ انوار اوست
معدنِ دل مخزنِ اسرارِ اوست

☆☆☆

دردلِ بندہ چو حق پرتو فگند
خارِ ہجرش راز پای دل بکند
ہمچو قطرہ کو بہ دریا اوفتاد
عینِ دریا گشت ، وصلش دست داد
زنگِ دل از صیقل رو پاک کن
سینہ با تیغ محبت چاک کن
اسمِ ذاتِ او چو بر دل نقش بست
سکۂ ضربِ محبت خوش نشست
اگر بینم شبی ناگہ من آن سلطانِ خوبان را
سری درپای او آرم فدا سازم دل و جان را

☆☆☆

من شنیدم ، یارِ من فردا رود راہِ شتاب
یا الٰہی تا قیامت بر نیابد آفتاب

☆☆☆

غیرت از چشم برم روی تو دیدن ندہم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

گرشی دست دہد وصل تو از غایت شوق[1]

تا قیامت نشود صبح دمیدن ندہم

گر بیاید ملک الموت کہ جانم بہ برد

تانہ بینم رخ تو، روح رمیدن ندہم

ہدیہ زلف تو گر ملکِ دو عالم بدہند[2]

یعلم اللہ کہ سرِ موی خزیدن ندہم[3]

گربہ دام دل می اوفتد آن عنقا باز

گرچہ صد حملہ کند باز پریدن ندہم

☆☆☆

آوازۂ عشق ما بہر خانہ رسید

دردِ دلِ مابہ خویش و بیگانہ رسید

از دردوغمِ عشق بہر جا کہ رویم[4]

از دوربگویند کہ دیوانہ رسید[5]

☆☆☆

---

[1] تذکرہ حسینی: گرشی وصل دہد دست نواز غایت شوق:۱۶۲-۱۶۵؛ بیاض: گرشی دست دھد وصل تواز غایت عشق:۲۰

[2] تذکرہ حسینی:۱۶۴: بیاض: بجاے زلف ''روی است: ص:۲۱

''ہدیہ روی تو گر گنج دو عالم بخشد''

[3] تذکرہ حسینی:۱۶۴: یعلم اللہ کہ سرموی تو دیدن ندہم

[4] تذکرہ حسینی:۱۶۵

از دردِ غمِ عشق بہر جا روم

[5] تذکرہ حسینی:۱۶۵

گویند زداہ دور دیوانہ رسید

نواب شکر اللہ خان خوافی خاکسار نارنولی

نواب شکر اللہ خان نام اور خاکسار تخلص تھا۔ ان کے والد کا نام خواجگی تھا۔ یہ سورت کے ایک سادات خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور شاہجہاں آباد صوبے کے ناظم عاقل[1] خان متخلص بہ رازی کے داماد تھے۔ شکر اللہ خان، اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں ترقی کر کے عالی رتبے پر پہنچے اور سرہند سہارنپور اور میوات کے نظم ونسق کی خدمات پر مامور ہوئے انھیں مرزا عبدالقادر بیدل (م: ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۰ء) سے خاص عقیدت تھی اور جب تک زندہ رہے ہر طرح سے مرزا کی خدمت کرتے رہے۔ شکر اللہ خان نے ۱۲۰۸[2] ھ (۱۶۹۶ء) میں نارنول میں وفات پائی۔ نشترِ عشق کے مصنف حسین قلی خان عاشقی نے قطعہ تاریخ وفات کہا ہے۔

آن جناب پاک شکر اللہ خان — شد روان ہی ہی سوی دار القرار
عاشقی آورد سال رحلتش — بودہ وی صاحب وفا و خاکسار

خاکسار کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

تلافی ہمہ بی رحمی و جفای شما — بیک نگاہ ادا شد، زہی ادای شما
تیغ تغافلت ہمہ خون سرشک ریخت — بر گردن تغافل تو خون بہای اشک
اشکم نماند بسکہ براہ تو ریختم — آمد بجای اشک دلم بر قفای اشک

نواب ضیاء الدین احمد خان نیّر رخشاں لوہارو

احمد بخش خان (م: ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء) والی فیروز پور جھرکا و لوہارو کی پہلی بیگم سے چار بچے ہوئے، لیکن ان میں سے کوئی زندہ نہیں رہا۔ بعد میں یہ بیوی بھی فوت ہو گئیں۔ اس کے بعد انھوں نے دو نکاح کیے۔ پہلا ایک میواتی خاتون سے اور دوسرا اپنے خاندان ہی میں۔ میواتی خاتون معروف بہ ''بہو بیگم'' صاحبہ سے شمس الدین احمد خان اور ابراہیم علی خان ہوئے اور خاندانی بیگم سے امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان۔ نواب احمد بخش خان نے اپنی زندگی ہی میں وصیت لکھ دی تھی، تاکہ بعد کو کوئی اختلاف پیدا نہ ہو۔ اس کی رو سے

---

۱ عاشق خان: تاریخ محمدی: ۸
۲ ۱۱۰۷ھ: ایضاً: ۸

بڑے بیٹے نواب شمس الدین کو فیروز پور جھرکا اور چھوٹے بیٹے ابراہیم علی خان کو نگینہ کی جایداد ملی۔ ۱۸۳۵ء میں نواب شمس الدین احمد خان کو دلی کے کمشنر فریزر[1] کے قتل کے جرم میں پھانسی دے دی گئی اور فیروز پور جھرکہ کی جایداد بھی ضبط کر لی گئی۔

جب ۱۸۲۷ء میں نواب احمد بخش خان نے وفات پائی تو اس وقت نواب ضیاء الدین چھ برس کے تھے۔ وہ ۱۴ اکتوبر ۱۸۲۱ کو فیروز پور جھرکا میں پیدا ہوئے۔ لوہارو کا نظم و نسق بڑے بھائی امین الدین خان کے ہاتھ میں رہا اور ان کے حصے کی آمدنی خزانے میں جمع ہوتی رہی بالغ ہونے پر لوہارو کی جایداد میں سے کوئی حصہ نہیں ملا، لیکن بطور وظیفہ اٹھارہ ہزار روپے سالانہ خزانہ لوہارو سے مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد ضیاء الدین احمد خان لوہارو چھوڑ کر دلی آ گئے اور پھر مستقلاً وہیں کے ہو رہے۔

نواب ضیاء الدین احمد خان کی تعلیم و تربیت گھر ہی پر ہوئی۔ مولوی کریم اللہ (مولانا شاہ عبدالقادر کے شاگرد) سے علم تفسیر اور حدیث، مفتی صدر الدین خان آزردہ (۱۲۰۴-۱۲۸۵ھ/۱۷۸۹-۱۸۶۸ء) سے فلسفہ اور مولانا فضل حق خیر آبادی سے منطق کی تعلیم پائی۔

نواب ضیاء الدین خان، فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں نیّر اور اردو میں رخشاں تخلص[2] کرتے تھے۔ اس کے علاوہ عربی اور ترکی میں بھی اچھی دستگاہ تھی۔ نیّر کی فارسی کی قابلیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ۱۸۸۴ میں مولانا شبلی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) نے شیخ علی حزین (۱۶۹۱-۱۷۶۴ء) کی طرح ''حیراں چہ کنم، فراواں چہ کنم'' میں غزل کہی۔ لوگوں نے اعتراض کیا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں کی غزلیں اہل علم و فضل اصحاب کے پاس بھیجی جائیں۔ جو اصحاب مقرر ہوئے، ان میں نیّر رخشاں کا نام بھی تھا۔ ان کے شخصی کتبخانے میں ہر قسم کی کتابیں تھی۔ یہ سارا سرمایہ ۱۸۵۷ میں نذر بہ تاراج ہو گیا۔

نیّر رخشاں کی تعلیم و تربیت میں غالب نے بہت دلچسپی لی اور اپنے اس شاگرد پر ان کو ناز تھا۔ غالب نے اپنی زندگی ہیں میں سند خلافت لکھ دی تھی۔ خلیفہ اول نیّر اور خلیفہ دوم نواب علاء الدین علائی مقرر ہوئے۔ رخشاں کا بیشتر کلام نظم و نثر ۱۸۵۷ء میں ضائع ہو گیا۔ بعد میں جو کچھ جمع ہو سکا ان کے چھوٹے صاحبزادے نواب سعید الدین احمد خان طالب (۱۸۵۲-۱۹۲۰ء) نے ''جلوہ صحیفہ زرین نیّر رخشاں'' کے نام سے شائع کر دیا تھا۔

نیّر رخشاں نے ۱۳ رمضان ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۷ جون ۱۸۸۵ء کو رحلت فرمائی۔ مہرولی میں حضرت خواجہ

---

[1] نواب شمس الدین احمد خان کے منہ چڑھے خادم کریم خان نے فریزر کو دلی میں ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ مخبری کے شک میں مرزا غالب بھی اس لپیٹ میں آ گئے تھے۔ فسانہ غالب از مالک رام: ص: ۹۲-۱۰۵۔

[2] اردو میں نیر اور فارسی میں رخشاں تخلص کرتے تھے۔ تذکرہ شعرائے اردو: ۲۲۳

بختیار کاکی قدس سرہ کی درگاہ میں اپنی خرید کردہ کوٹھی (مرزا بابر والی) میں دفن ہوئے۔ مولوی رضی الدین احمد خان دہلوی نے بے مثل مادۂ تاریخی بہم پہنچایا، جس پر مولانا حالی نے مصرعے لگائے:

چون ضیاء الدین احمد خان کشید
رفت از دنیا سوی دار السلام
گفت ہاتف بارضی سال وفات
روز شنبہ سیزدہ شہر صیام

فارسی اشعار کا نمونہ یہ ہے:

مکن ہلاک کہ شادم بہ ناروای خویش — بر روی من بکشا چشم اعتبار مرا
دلش بسوخت چو بر کار ہای بی مزدم — وفا نتیجہ بہ از مزدِ درد کارِ مرا
نمودہ سعی بہ بی برگی من و خجلم — بکیسہ نیست چوں مزد روز گار مرا
زتیرہ روزی و آشفتگی و رنجوری — بسنج خالِ رخ و زلف و چشم یار مرا

☆☆☆

روش دہر بیک گونہ نباشد نیر — نہ چنین بود کہ ہست و نچنان است کہ بود

ملا طاہری پانی پتی

ہندی اور فارسی زبان میں اشعار کہتے تھے۔ فن موسیقی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ لوگ ان کے اخلاق اور طرز معاشرت کے فریفتہ تھے۔ شاہجہاں کے دور (۱۶۲۷-۱۶۶۶ء) میں بقید حیات تھے۔ نمونہ کلام نہ مل سکا۔

طفیلی حصاری

تذکرہ نویسوں نے طفیلی کی لطافت طبع، شیرین زبانی، خوش مذاقی اور خوش گفتاری کی تعریف کی ہے۔

ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

چساں پنہان شمی در کوی آن آتش فگن باشم
کہ برق آہ روشن میکند جائیکہ من باشم

عاصی کرنالی

ان کا فارسی کلام اکثر ''دانش'' میں شایع ہوتا رہتا ہے۔ان کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں مل سکیں۔صرف اتنا معلوم ہے کہ ملتان یونیورسٹی میں ادبیات اردو و فارسی کے استاد ہیں۔نمونہ کلام یہ ہے۔

ای بساد لہا کہ ویراں کردہ ای　　صد گلستان را بیاباں کردہ ای
دادہ ای مارا متاع آہ داشک　　اہتمام بادو باران کردہ ای
ای چنان حسنت تجلی آفرین　　آینہ را چشم حیران کردہ ای

☆☆☆

لطفاً درونِ سینہ ما دل نہادہ اند　　تخم قیامتی ست کہ در گل نہادہ اند
شب دیدہ ام بخواب کہ باورنکردنی ست　　بر قبر کشتگان سر قاتل نہادہ اند
ہاں! مشکلاتِ اہل وفا بین وخندہ زن　　در خندہ تو حل مسائل نہادہ اند

☆☆☆

من کہ مست ازمئی رنگین سبو بیش باشم　　بست دردام دوزلفین نیکو لیش باشم
دوش در محفل رندان نظر افتاد براو　　زین سبب عاشق آن گلگوں رویش باشم

حافظ قاضی عبدالرحمٰن تحسین پانی پتی

ان کے والد کا نام مولوی عبدالہادی تھا۔یہ حضرت محمد جلال الدین کبیر الاولیا کی اولاد میں سے تھے۔پانی پت کے مشہور قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی[1] بھی اسی خاندان سے تھے۔

تحسین نے ضروری علم دلی میں حاصل کیے تھے۔وہ غالب کے شاگرد تھے اور حالی[2] کے بہت گہرے دوستوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ان کے نام حالی کے دو خط بھی شائع ہو چکے ہیں۔ان کا دیوان شائع نہیں ہو سکا، اگرچہ اس کی موجودگی کا علم ہے[3]۔

---

[1] ۱۱۴۳-۱۲۲۵ھ (۱۷۳۵-۱۸۱۳ء)

[2] ۱۸۳۷-۱۹۱۴

[3] شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کے پاس موجود تھا (بقول مالک رام صاحب)

تحسین نے ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۷ء) میں انتقال کیا۔ اردو کی نسبت فارسی کی طرف زیادہ توجہ تھی نمونہ کلام یہ ہے۔

تو زخمِ خنجرِ قاتل نخوردی چہ دانی لذت بسمل شدن را
بسودا قوت دستم گر این ست توانم چاک زد جیب وکفن را
دروغی کرد از صدق محبت بمردن زندہ نام کوہکن را

☆☆☆

گر خوش ونغز ند حوراں، باتوارز انی ہمہ بامنِ مجنون رہا کن، واعظ! آن مہ پارہ را
شورِ قلقل بود تحسین! شب درون خانہ ات داشتی مہماں کدا مین شاہد می خوارہ را

☆☆☆

آنانکہ حق جلوہٗ جانانہ شناسند درسنگِ حرم، آتش بتخانہ شناسند
زاہد! نشوی منکرِ رندان کہ بمستی رازِ دو جہاں، ، از خطِ پیمانہ شنا سند
دانند کہ آوار گیم از پی کا ریست فریاد کہ مجنونم و فرزانہ شنا سند

☆☆☆

آنم کہ حریفم نگہ عشو ہ گراں را تیز است گر این دشنہ، مراہم جگر است

☆☆☆

خشک شد دامنِ تر بادہ نابی ساقی داغم از زہد ریائی دمِ آبی ساقی
زلفِ تر سا بچگا نم، سوی میخانہ کشید ورنہ من بودم و کنجی و کتابی ساقی!

☆☆☆

شیخ عبدالفتاح فتاحی کرنالی

شیخ عبدالوہاب کرنالی کے فرزند تھے۔ شعرگوئی و معماوعروض وقافیہ میں کمال حاصل تھا۔ باپ اور بیٹے اپنے وقت کے مشاہرین میں سے تھے۔ دونوں بہت ہی لطیف شعر کہتے تھے۔
فتاحی نے شاہجہاں کے عہد حکومت (۱۶۲۷-۱۶۶۶ء) میں ۱۰۴۴ھ (۱۶۳۴ء) میں وفات پائی۔

فتاحی "طبقات شاہجہانی" کے مصنف محمد صادق دہلوی کے قدیم دوستوں میں سے تھے۔ فتاحی کی وفات پر خود محمد صادق نے لکھا تھا۔

شیخ فتاحی کرنالی بود در لطافت رونق کرنالیان
در عبادتہا عدیم المثل بود در فضایل بود یکتای زمان
صوم داؤدی و ذکری نیم شب داشتی آنمرد عابد جاودان
ناگہ از ملک فنا بادی و زید ہمچو گل پژمردہ رفت از بوستان
سال فوت او طلب کردم ز عقل شد سراسیمہ خرد از درد آن
چون شنید این واقعہ از روی غم گفت صادق آہ شیخ عابدان

فتاحی کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

در بہارِ ہر خزاں صد نو بہار از حسن اوست جلوۂ گلزار و نازِ باغبان در کار نیست

☆☆☆

خوش جنونِ ماد خوش احوال ماکان زلفِ یار در چمن سنبل شدد در پای ما زنجیر شد

☆☆☆

بکنج کلبہ بگذارید ما جمع پریشانزا کہ مرغان قفس پروردہ راگلشن بود زندان

☆☆☆

عبدالواحد وحشتؔ تھانیسری

تخلص وحشتؔ اور نام شیخ عبدالواحد[1] تھا۔ یہ حجۃ الاسلام امام غزالی کی اولاد میں سے تھے۔ شاعری میں ناصر علی سرہندی (متوفی: ۱۱۰۸ھ/۱۶۹۶-۹۷ء) کے شاگرد تھے۔ کچھ دنوں بیدلؔ کے ساتھ بھی رہے۔ اس کے بعد دکن میں جا کر عالمگیری فوج میں ملازم ہو گئے۔ یہاں ان کا بیشتر قیام اورنگ آباد میں شاہ گلشن (م: ۱۱۴۰/۱۷۲۷-۲۸ء) کے ساتھ رہا د گیارہویں صدی ہجری کے اواخر میں وفات پائی۔

"کلمات الشعرا" کے مصنف سرخوش لکھتے ہیں کہ یہ نوجوان شاعر ہمیشہ شوخ الفاظ کی تلاش میں کوشا

---

[1] ان کا نام "آفتاب عالم تاب" میں غلام نبی اور "شمع انجمن" میں شیخ عبداللہ آیا ہے۔ روز روشن-۷۵۳، تذکرہ حسینی: ۳۶۱: عبداللہ

رہتا اور بلند استعارات استعمال کرتا تھا۔

''سفینۂ خوشگو'' کے مصنف بندرابن داس خوشگو کا کہنا ہے کہ وحشت نے ایک دیوان اور مثنوی مرتب کی تھی۔ دیوان کا ایک نسخہ ایڈن برا لائبریری میں موجود ہے۔ اس میں زیادہ تر غزلیں ہیں۔ ان کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

چشم را خالی کن از دیدن، تماشا نازک است
آرزو درسینہ لیکن، جلوہ آرا نازک است
شوخی چشم قابل کیفیت دیدار نیست
شیشہ از حیرانی دل کہ صہبا نازک است

☆☆☆

جام تہی بدست زنرگس گرفتہ ست ..... چشمی کشا کہ میطلبد بوستان سراب

☆☆☆

پیام وصل بی قاصد بفرماسوی من آید ..... برای خواب از خود رفتنی افسانہ میخواہم

☆☆☆

توای رم آفرین از حلقہ چشم تماشائی ..... برنگی کردۂ وحشت کہ دریا دم نمی آئی

☆☆☆

بحفلیکہ حریفاں وحدت آہنگ اند ..... ہم چو دیدہ تصویر محو یکرنگ اند

☆☆☆

ابوالبیان مولانا عثمان الدین تسلیم نارنولی

ان کے والد کا نام قاضی نظام الدین تھا۔ ۳۴ واسطوں سے ان کا سلسلہ نسب تیسرے خلیفہ عثمان غنی (شہادت: ۱۳ ذی الحجہ ۲۵ یا ۲۶ھ/ ۳۰ ستمبر ۶۴۵ء یا ۱۹ ستمبر ۶۴۶ء) سے ملتا ہے۔ ان کے مورث اعلیٰ مولوی درویش محمد بدایوں میں مفتی تھے۔ ان کے فرزند مولوی امین الدین ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۰ء) میں نارنول کے قاضی مقرر ہو کر وہاں پہنچے۔

تسلیم ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) میں پیدا ہوئے۔ بہت ذہین آدمی تھے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا

سکتا ہے کہ ۱۲ سال کی عمر میں اپنے ماموں مولانا ابوالکلام، محمد عمر رشید الدین فاروقی المتخلص بہ منتظر و فائز (۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء) سے تعلیم حاصل کر کے فارغ التحصیل ہو گئے۔ شاعری میں بھی اپنے ماموں ہی کے شاگرد تھے۔

تسلیم ۱۸۵۷ء میں صدر فوجداری جے پور میں نائب ناظر مقرر ہوئے۔ سال بھر کے اندر ہی یہاں سے تبادلہ ہوا اور وہ سررشتہ تعلیم کے تحت اورینٹل کالج میں مدرس اول مقرر ہو گئے اور یہاں تقریباً ایک سال رہے، پھر مدرسہ تعظیمیہ چلے گئے۔ کچھ عرصہ تک مفتی ریاست (جے پور) کی حیثیت سے کام کیا۔

انھوں نے اپنی تصنیف 'تربات الکربلا'' میں اپنے حالات خود قلمبند کیئے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ قریشی عثمانی النسب اور سنی نعمانی المذہب تھے۔

باوجود عزت نفس اور تبحر علمی کے طبیعت میں انکسار اور فروتنی بہت تھی۔ اگر کبھی کسی سے ادبی اور علمی اختلاف ہو جاتا، تو ان کا رنگ اصلاحی رہتا، کبھی اس میں تنقیص کا پہلو نہیں ہوتا تھا۔

اساتذہ کا ادب اور اعتراف، تلامذہ کے لیے بمنزلہ فرض عین سمجھتے تھے۔ روزانہ قرآن کی ایک منزل کی تلاوت اور پابندی کے ساتھ تہجد ادا کرنا ان کے معمولات میں سے تھا۔ بزرگان دین سے خاص عقیدت تھی۔ حضرت شاہ حبیب الرحمن جمالی سرساوی (اولادِ چہارم قطب ہانسوی) سے بیعت تھے۔

ان کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے۔ بہت لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا اور ان کے معاصرین انھیں خاص اعزاز و احترام سے دیکھتے تھے۔

اولاد میں صرف ایک صاحبزادی تھیں جو مولانا تسنیم نارنولی سے منسوب ہوئیں۔

افسوس ہے کہ تسلیم عین شباب میں چل بسے۔ ۲۵ جمادی الاخر ۱۳۰۱ھ (۲۳ اپریل ۱۸۸۴ء) کو صرف ۴۵ سال کی عمر میں نارنول میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

ان کے فارسی کلام میں بلا کا زور اور غضب کی آمد ہے قادر الکلامی کا یہ عالم ہے کہ ایک قافیہ کئی کئی طرح سے باندھتے ہیں اور ہر جگہ مضمون نیا اور طرزِ ادا نرالی معلوم ہوتی ہے۔ صنائع اور بدائع لفظی اور معنوی کی کثرت حیرت اور استعجاب پیدا کرتی ہے۔ عربی جملوں اور مقولوں کو اس خوبی سے تضمین کرتے ہیں کہ فارسی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ کنایت کو ہر جگہ صراحت پر ضروری سمجھتے ہیں۔

اِمشب چو فراز سطح خفتم   افسانہ عاشقی شگفتم
در گوش ولم ترانہ افتاد   درجان ززبان زبانہ افتاد

☆☆☆

آمد بدرونِ می خروشی   در سینہ زدل رسید جوشی

با شور چکیدنی بر آمد   گلزار دمیدنی بر آمد

☆☆☆

تسلیم نے "نظام السحر" کے عنوان سے نواب کلب علی خان والی رامپور کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ غالب اسی زمین میں ان کے والد نواب یوسف علی خان (والی رامپور) کی مدح میں قصیدہ لکھ چکے تھے۔ دونوں قصیدوں کے مطلع نمونے کے طور پر دیکھیے:

غالب:

ہمانا اگر گوہر جان فرستم   بہ نواب یوسف علی خان فرستم

تسلیم:

کیم من کہ جان بجانان فرستم   مگر برگ گاہی بہ بستان فرستم

اسی طرح غالب نے راجہ نرندر سنگھ (والی پٹیالہ) کی مدح میں قصیدہ لکھا تھا۔ تسلیم نے مہاراجہ مہندر سنگھ (والی پٹیالہ) کی مدح میں قصیدہ کہا۔ دونوں کے مطلعے ملاحظہ ہوں۔

غالب:

سحر کہ بادِ سحر عرضِ بوستان گیرد   دہد بہ نکہت گل حکم تا جہاں گیرد

تسلیم:

سپیدہ دم کہ صبا راہ مغز جان گیرد   بیک نفس ہمہ اقلیم بوستان گیرد

فارسی نظم:

نوادر النظم: ۸۹۴۶ اشعار پر مشتمل ایک ضخیم مثنوی ہے۔ شروع میں ایک مبسوط دیباچہ ہے اور آخر میں ایک ۴۵ صفحات کا طویل خاتمہ ہے (غیر مطبوعہ)

لیلیٰ مجنون: یہ بھی علم وادب میں ایک ضخیم مثنوی ہے۔ اس میں نو ہزار سات سو نوے اشعار ہیں۔ ناقص الاخر ہے۔ (غیر مطبوعہ)

تسمیۃ الرقم: نواب محمد علی خان والی ٹونک کی مدح میں ایک مثنوی ہے اس مثنوی کے اشعار کی تعداد ۳۶۱ ہے۔

رقم نذر: یہ مثنوی نواب کلب علی خان والی رامپور کی مدح میں ہے اس میں "۳۶۱" اشعار ہیں۔

تحفۃ الشیون: یہ مثنوی مہاراجہ مہندر سنگھ والی پٹیالہ کی تعریف میں ہے۔ یہ ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء)

میں لکھی گئی تھی (غیر مطبوعہ)

ان کے علاوہ متعدد مثنویاں (غیر مطبوعہ) موجود ہیں۔ایک ضخیم دیوان بھی غزلیات، رباعیات اور قطعات پر مشتمل غیر مطبوعہ رہ گیا ہے۔

لمعات: یہ ایسی غزلوں کا مجموعہ ہے جس کا ایک مصرع تسلیم کا ہے اور ایک شیخ عطا حسین شور کا (وفات: ۱۸۸۰) (غیر مطبوعہ)

سید علاء الدین پانی پتی

سلطنت دور میں فارسی کے بہت شعرا اور علما ہو گزرے ہیں۔ان میں سب سے پہلا علاء الدین پانی پتی تھا۔یہ علاء الدین خلجی (۱۳۱۶-۱۲۹۶ء) کے دور میں ہوا تھا اور اپنے دور کے مشہور عالموں میں اس کی گنتی ہوتی تھی۔یہ عربی اور فارسی کے عالم تھے اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ان کی عربی اور فارسی میں آدھا درجن تصانیف ہیں، لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ اب ان کی کوئی بھی تصنیف دستیاب نہیں ہے۔ضیاالدین برنی نے اپنی کتاب ''تاریخ فیروز شاہی'' میں ان کی علمیت کی بہت تعریف کی ہے۔

نمونہ کلام نہ مل سکا۔

نواب علاء الدین احمد خان علائی والی لوہارو

علائی لوہارو کے نواب امین الدین احمد خان (۱۸۱۳ء-۱۸۶۹ء) کے فرزند ارجمند تھے۔ان کی والدہ کا نام ولی النسا بیگم تھا جو نواب غضنفر الدولہ محمد وزیر بیگ عرف مینڈو خان رسالدار سلطنت اودھ کی صاحبزادی تھیں۔علائی ۴ ذی الحجہ ۱۲۴۸ھ (۲۵ اپریل ۱۸۳۳ء) کو دلی میں پیدا ہوئے۔

علائی کی تعلیم وتربیت مرزا غالب کی نگرانی میں ہوئی۔مرزا غالب انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ غالب نے انھیں ایک سند دی تھی، جس میں انھیں اپنا خلیفہ اور جانشین مقرر کیا تھا۔

علائی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔زیادہ تر وقت علمی اور ادبی مشاغل میں گزرتا تھا۔لوہارو میں چھاپا خانہ بھی ''فخر المطابع'' کے نام سے قائم کیا تھا، جہاں سے علمی اور ادبی کتابیں شایع کرتے رہے۔ایک پندرہ روزہ اخبار ''امیر الاخبار'' اس مطبع سے نکلتا تھا۔

علائی نے کبھی اپنا کلام جمع کرنے کی کوشش نہیں کی اور جس پائے کے وہ عالم اور فاضل تھے، اس کے مقابلے میں اپنی کوئی بڑی علمی یادگار بھی نہیں چھوڑ گئے۔

نواب علائی کی شادی ۱۸ فروری ۱۸۵۵ء کو نجیب آباد میں جلال الدین احمد خان کی صاحبزادی شمس النسا سے ہوئی تھی، جس سے ان کے پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہوئیں۔

علائی نے ۳۱ اکتوبر ۱۸۸۴ (۱۱ محرم الحرام ۱۳۰۲ھ) کو وفات پائی اور قطب صاحب میں مرزا بابر والی کوٹھی میں اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے۔

فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے۔

پیدا نبود پیش از یں خود عیان ما
برداشت پردہ گر یہ زرازِ نہانِ ما

مشکل بہ بین چگونہ زخویشتن خبر دہیم
کاتش بنامہ درزدہ سوزِ بیانِ ما

از سوزش است رونق ما چو نہالِ شمع
عین بہارِ ماست ہما نا خزانِ ما

ساز وجرس زنالہ سرشکم بہ کوے دوست
محتاجِ راہبر نشود کاروانِ ما

پروانہ نیستیم کہ از تاب جاں دہم
برشاخِ شعلہ بستہ فلک آشیان ما

تلخی دردِ ہجر زبس در تنم نشست
زین پس ہُما ہمی نخورد استخوانِ ما

لیلیٰ کند ملامت مازان سبب کہ قیس
گم کردہ راہِ شوق زشورِ فغانِ ما

گوئی کہ مجراست علائی ! دل حزین
ریزد شرارہ جای سخن اززبان ما

☆☆☆

روزی نشد که اشک زفرقم گزر نہ کرد
ازسرگزشت ودامنِ افلاک تر نہ کرد
درمرگ نیست برسرِمن منت ازاجل
تیرِ تو کارکرد، دعای سحر نہ کرد

☆☆☆

ہاں خدا را !زدد تر گوئید باجانان من
کے رسی آخرکہ جان بر لب رسید ای جانِ من
دعویِ الفت مکن، ای قیس !کاندر راہِ عشق
بر تودشوار است تمکین، واں بود آسانِ من

☆☆☆

نازم شبِ وصلِ صنم، مہ جلوہ جاناں در بغل
من گشتہ از خود بیخبر ، او خفتہ آساں در بغل
زلفی و صد مشک ختن چشمی، و چندین سحر و فن
روی وگل در آستین ، بوی دبستان در بغل

☆☆☆

صدرہ بہ خطا زمرد معذوری بہ
صدرہ بہ عیوبِ دوست مستوری بہ
فتوئی کہ زپیر دل گرفتم ، اینست
قُربی کہ بہ عادل نبود، دوری بہ

☆☆☆

ایی چرخ، چرا ستیزہ با ماداری
دانم کہ غلط نہ ، نہ بیجا داری
خواہی کہ دہی نقش وجودم بر باد
آری کہ مرا بدہر یکتا داری

عنایت اللہ شوق فرید آبادی

فرید آباد کے رؤسا میں تھے۔ نجابت اور شرافت کی دولت سے مالا مال، ان کے آباو اجداد ہمیشہ مساعدت روزگار سے فارغ البال رہے۔ انھوں نے بعدِ تحصیل علمِ طب، ایک مدت تک سرکار انگریزی کی ملازمت میں رہے۔ جب یہ خدمات مذکورہ سے سبکدوش ہو کر انگریزی سرکار سے پنشن پانے لگے تو مخلوق خدا ان کے مطب سے فیض پانے لگی۔ آخری عمر میں پنجاب میں جا بسے تھے۔

فنِ شعر میں مولوی امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے۔ ذوق و مومن کے دیکھنے والے تو کیا، بلکہ ان کے ہم جلیس و ہم صحبت رہے ہیں۔ آدمی خوش فکر تھے۔ اردو اور فارسی دونوں میں کہتے تھے۔ ان کا دیوان مرتب ہو چکا تھا۔

نمونہ کلام یہ ہے:

تبرک دوست مفرمائی بعد از ین ناصح!
نمانده بر دل خود ہیچ اختیار مرا
من وطپیدن دل از غمت بکنج قفس
اسیرِ دامِ توام، باچمن چہ کار مرا
زضبط، نالہ نیارم بلب ولی ترسم
کز اہل درد نیارند درشمار مرا

☆☆☆

چہ نقش خدمت مسجد نشیندم بر دل
کہ گردِ سجدۂ اصنام بر جبین دارم

☆☆☆

نمی نالم ز درد بیکسی کز شعلہ آہم
گیاہی کز مزارم رست شد شمع مزار من
مرو دامن کشاں از تربتم ای آفت جانہا
کہ شور صد قیامت خیزد از مشت غبار من

شمی میخواہم ای شوق ار کند بختم مددگاری
کہ تنہا من بخلوت باشم و باشد نگار من

☆☆☆

از تماشای چمن طرف نہ بندم کہ مرا
سینہ از چاک بود رشکِ گلستانی چند

☆☆☆

غمِ تو روز وشب ای دوست ہمنشین دارم
زدرد چشم تر و خاطر حزین دارم

☆☆☆

صدائی آمد کس از درِ کاشانہ می آید   بنہ گوش ای دل مضطرب ببیں جانا نہ می آید
از ین میخانہ کس میداد زاہد را نمیدانم   کہ رقصان و ترنم گو بکف پیمانہ می آید
وفوراشک در چشم ونگہ از شوق دیدارش   بردن چون رشتہ تسبیح از ہر دانہ می آید

☆☆☆

غلام حسین خان خیالؔ پانی پتی

غلام حسین خان[1] متخلص بہ خیال پانی پت[2] کے باشندے اور قوم کے انصاری تھے۔ ان کی جایداد بہت تھی اور ان کے آبا واجداد عمدہ زندگی بسر کرتے تھے۔ زیب النسا بیگم کی سرکار میں چار سو روپیہ سالانہ مقرر تھا۔ بہت ہی خلیق، مؤدب، متواضع اور قابل شخص تھے۔ ۱۱۵۶ھ (۱۷۴۳ء) میں وفات پائی۔

خیال زیادہ تر فارسی میں کہتے تھے۔ ان کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زیادہ بتائی جاتی ہے۔ مولوی کریم الدین (طبقاتِ شعراے ہند) نے لکھا ہے کہ ان کا دیوان پانی پت میں موجود تھا۔

عیار الشعرا میں آیا ہے کہ ناسازگاری زمانہ کی وجہ سے اپنے قدیم مسکن دلی سے ہجرت کر کے سونی پت میں استقامت اختیار کر لی تھی۔

نمونہ کلام دستیاب نہ ہو سکا۔

۱۔ بیشتر تذکروں میں ان کا نام غلام حسین خان لکھا ہے، لیکن سخن شعرا اور گلستان بے خزاں میں غلام حسن خان دیا ہے۔
۲۔ یادگار شعرا: ۷۱: سونی پت۔

حکیم میر فضل اللہ مرزا پانی پتی

یہ بینا کے نام سے بھی مشہور تھے۔ طب میں بہت مہارت رکھتے تھے اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ اکثر لوگوں کو فارسی انھی نے سکھائی تھی۔ کریم الدین (مصنف۔ طبقات الشعرائے ہند) کے والد نے بھی انھی سے فارسی سیکھی تھی۔ اپنے زمانے کے اچھے فارسی داناں اور طبیبوں میں اسکا شمار ہوتا تھا۔ ۴۰ برس کی عمر میں وفات پائی۔

مرزا عبدالقادر کی اولاد میں سے تھے۔

اشعار کے نمونے نہ مل سکے۔

میر قاسم علی قاسمؔ پانی پتی

قاسم تخلص اور نام میر قاسم تھا۔ یہ پانی پت شہر کے منصف تھے۔ شیوۂ عدل وانصاف میں مشہورِ زمانہ اور کمالات اکتسابی اور ذہنی میں یگانۂ روزگار تھے۔ گاہ گاہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ نمونہ پر صرف ایک شعر ملا ہے۔

گرچہ پیدا کردم نام خود بہ گل رنگی شراب
چوں بہ لعلِ او رسد از عکس گلگوں تر شود

قلندر شاہ بخش ترابی پانی پتی

پانی پت کے رہنے والے تھے۔ طبیعت بہت موزوں پائی تھی۔ فارسی نظم ونثر دونوں میں ان کو بہت مہارت حاصل تھی۔

ستر برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ عظیم آباد میں مدفون ہیں۔ افسوس اس سے زیادہ حالات نہیں مل سکے۔ نمونے کے طور پر ان کا ایک شعر درج ہے:

اگر مزاجِ ترا بامن امتزاجی نیست　　مراست جرم کہ خودکردہ را علاجی نیست

حافظ قلندر بخش زیرکؔ پانی پتی

حافظ قلندر بخش زیرک شروع میں اردو میں بیدم تخلص کرتے تھا اور قصائد عربی میں عالم۔ اگر چہ رہنے والے پانی پت کے تھے مگر تعلیم و تربیت شاہجہاں آباد میں اور لکھنو میں انجام پائی۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ اپنے علم و فضل کا بہت غرور تھا اور دماغ ان کا ہمیشہ ساتویں آسمان پر چڑھا رہتا تھا۔ فارسی کلام کا نمونہ نہ مل سکا۔

میر قمرالدین منت سونی پتی

سید میر قمرالدین منت[1] ہریانہ کے وہ مایۂ ناز شاعر تھے جنھوں نے نہ صرف خود، بلکہ ان کے پورے خاندان نے فارسی اور اردو ادب کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ منت کا اپنا میدان تو فارسی نظم اور نثر تک محدود رہا، لیکن ان کے فرزند رشید نظام الدین ممنون (م: ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء)، میر صادق علی صفدری، میر باقر علی جعفری[2] (م: ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء) اور میر شمس الدین احسانؔ نے اردو نظم کو مالا مال کیا۔

منت کا آبائی وطن مشہد (ایران) تھا۔ ان کے والد گرامی عبداللہ، امام ناصرالدین[3] سونی پتی کے نام سے مشہور اور وہیں مدفون بھی ہیں۔ اجدادِ مادری کی طرف سے سلسلۂ نسب شاہ عنایت اللہ صفوی اور سید جلال بخاری و شاہ عبدالعظیم چشتی کشک ابوزینی تک پہنچتا ہے۔

منت ۱۱۵۶ (۱۷۴۳ء) میں سونی پت[4] میں پیدا ہوئے، جو دلّی کے نزدیک ہریانہ میں واقع ہے۔

---

1. اس شاعر کا تخلص ''ضیغم'' اور ''محیط'' بھی ہے۔ گلشن ہند (حیدری)۔ ۹۲ (پایہ ورق)
2. مجموعہ نغز کے انڈیا آفس لائبریری کے نسخے میں جعفر لکھا ہے۔ مجموعہ نغز۔ ۱۶۸
3. سید محمد بہار اور ظہیرالدین مسعود مصنفِ 'زبدۃ الصرف'' و شعبات ان کے اعقاب میں سے تھے۔ صحف ابراہیم۔ ۱۲۹
4. شاہجہاں آباد (دہلی) صحف ابراہیم: ۱۲۹:
بسولی تذکرہ شعرائے اردو: ۱۶۶؛
سرہند تذکرہ شعرائے ہندی۔ ۲۹۴

منت کی پھوپھی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۷۰۲-۶۲-۱۷ء) کی زوجہ اور خود ایک عالم و فاضل خاتون تھیں۔ ان کا قیام دلی میں تھا۔ منت نے دلی میں ان ہی کے یہاں نشو و نما پائی۔ انھوں نے کچھ علوم متداولہ کی کتابوں کا مطالعہ حضرت شاہ ولی اللہ سے کیا۔ لیکن دوسرے مشاغل کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

منت مشہور ولی اللہ حضرت مولوی فخر الدین قدس سرہ کے مرید تھے اور انھی سے شرف بیعت تھا اور کیفیت راہ طریقت اور معرفت بھی ان کی خدمت میں رہ کر سیکھا۔

جب شروع شروع میں طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہوئی تو میر نور الدین نوید سے اصلاح لینی شروع کی۔ جب ۱۶ برس کے ہوئے تو میر شمس الدین فقیر[1] کی صحبت میں پہنچے اور ان سے فن شاعری کی تکمیل کی۔ علی ابراہیم خان خلیل (م: ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ء) "صحف ابراہیم[2]" میں لکھتے ہیں کہ جب ۱۱۹۵ھ (۱۷۸۰ء) میں مرشد آباد میں ان کی منت سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ ایک شعر کے سوائے کسی شعر کی اصلاح انھوں نے فقیر سے نہیں لی۔ فقیر نے منت کو فارغ اصلاح قرار دے دیا تھا۔ اسپرنگر نے "یادگار شعرا[3]" میں منت کو علی ابراہیم خان خلیل کا بھی شاگرد بتایا ہے۔ لیکن خود خلیل نے اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ غالباً یہ ٹھیک نہیں ہے اور اسپرنگر کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

ایک تو یہ کہ ان کو شعر گوئی میں اچھی دستگاہ حاصل ہو گئی تھی اور دوسرے یہ کہ شاہجہاں آباد رفتہ رفتہ ویران ہوتا جا رہا تھا، اس لیے منت ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷ء) میں دہلی سے لکھنؤ چلے گئے۔ لکھنؤ میں انھوں نے امامیہ[4] مذہب اختیار کیا۔ یہیں پر ان کی میر محمد حسین فرنگی لقب سے ملاقات ہوئی۔ صاحب دولتان کی مدح میں قصیدہ لکھا اور انعام پایا۔ مسٹر جانسن بہادر کی سرکار میں رسائی حاصل کی۔ موصوف ان کی شاعری سے بہت متاثر ہوئے اور اپنے ہمراہ کلکتہ لے گئے اور اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز سے تعارف کرا دیا۔ ہیسٹنگز نے نہ صرف یہ کہ منت کی تعریف کی بلکہ انھیں ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ اس کے بعد یہ حیدر آباد چلے گئے اور نظام الملک آصف جاہ (۱۷۱۳-۴۸-۱۷ء) سے ایک قصیدے کے صلے میں دو ہزار[5] روپیہ نقد و جنس و ذخیرہ حاصل کیا۔

---

[1] ۱۱۱۵-۱۱۷۰ھ (۱۷۰۳-۱۷۵۶ء) فقیر۔ جلوہ خضر۔ ۲۰۲۔

[2] صحف ابراہیم۔ ۱۲۹؛

[3] یادگار شعرا: ۲۶۶

[4] شیعہ مذہب کو امامیہ مذہب بھی کہتے ہیں۔

[5] ۵ ہزار یادگار شعرا: ۱۶۶
دس ہزار گلشن بے خار: ۱۹۳

بعد میں سیر و سیاحت کرتے ہوئے پھر لکھنؤ پہنچ گئے۔ بھگوان داس ہندی کہتے ہیں[1] کہ انھوں نے منت کو مہاراج ادھیراج ٹکیت رائے نرینداربہادر کی ملازمت میں پہنچایا جہاں سے ان کا سو روپیہ مہینہ وظیفہ مقرر رہوا۔

۱۲۰۶ھ (۱۷۹۱ء)[2] میں نواب سرفراز الدولہ میرزا حسن رضا خان بہادر اور مہاراجہ ٹکیت رائے کے کسی مقدمے کے سلسلے میں ان کے ہمراہ کلکتہ گئے۔ وہاں ان کو تپ محرق عارض ہوا جو موت کا بہانہ بن گیا۔ تین چار دن کے بعد جان بحق ہو گئے۔ کلکتہ میں ہی دفن ہوئے۔ منت کے سالِ وفات کے بارے میں تذکرہ نویسوں کے مختلف بیانات ہیں۔ شیفتہ[3] اور مصحفی[4] نے لکھا ہے کہ منت نے ۱۲۰۷ھ (۱۷۹۲ء) میں وفات پائی۔ قاسم[5]، ذکا[6] اور نساخ[7] کے مطابق ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳ء) میں وفات پائی۔ لیکن یہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ منت نے ۴۹ سال کی عمر پائی۔ اس کے برعکس کریم الدین[8] لکھتے ہیں کہ منت نے ۳۹ سال کی عمر میں وفات پائی۔ یہ غلط معلوم ہوتا ہے۔

منت کی عادات اور اخلاق کے بارے میں کسی تذکرہ میں تفصیل نہیں ملتی، ہاں ایک دو تذکروں میں یہ ضرور لکھا ہے کہ منت عاشق مزاج آدمی تھے۔ کریم الدین لکھتے ہیں، عشق پر بہت رغبت رکھتا تھا اور خوبصورت وحسین چہرے سے بہت متوجہ ہوتا تھا[9]، قاسم لکھتے ہیں کہ منت کے ہاں ایک رقاصہ ملازم تھی۔[10]

منت کے چار بیٹے تھے اور چاروں کے چاروں شاعر۔ ان کے نام ہیں نظام الدین ممنون، میر صادق علی صفدری، میر باقر علی جعفر اور میر شمس الدین احسان۔

ان میں سے میر نظام الدین ممنون سب سے زیادہ مشہور ہیں اور اپنے وقت کے بہت نامی شاعر ہو گذرے ہیں۔ ان کے شاگردوں کی بہت بڑی تعداد تھی جو ملک کے دوسرے حصوں میں ملتی ہے۔

قمر الدین منت فارسی کے مسلم الثبوت شاعر تھے۔ ریختہ میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کے فارسی

۱۔ سفینہ ہندی: ۱۹۳

۲۔ گلشن ہند (گلزار ابراہیم) ۲۳۰

۳۔ گلشن بیخار: ۱۹۳

۴۔ تذکرہ ہندی: ۲۳۸

۵،۹۔ مجموعہ نغز: ۲۱۵

۶۔ عیار الشعرا: ۳۶۴

۷۔ سخن شعرا: ۴۵۷

۸،۹۔ طبقات شعرائے ہند: ۱۷۸

۱۰۔ مجموعہ نغز: ۲۱۵

اشعار کی تعداد ڈیڑھ لاکھ بتائی جاتی ہے۔ اپنے اشعار کی تفصیل خود منت نے اپنی مثنوی چمنسان میں یوں دی ہے:

درایں عمر دہ مثنوی گفتہ ام — بہ آیینِ وطرزِ نوی گفتہ ام
چو اشعار من در عددمی رسد — شمار قصائد بصد می رسد
بود شعر من در غزل سی ہزار — ز پانصد رباعی گرفتم شمار

منت ہر اصناف سخن میں قدرت کاملہ رکھتے تھے اور یہ ان کی تصانیف کے تنوع سے بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ منت کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

دیوان: فارسی کا ذخیم دیوان چھوڑا ہے۔ اس کا ایک نسخہ خدا بخش لائبریری میں بھی موجود ہے۔

مثنوی: جیسا کہ مذکور بالا اشعار سے ظاہر ہے، انھوں نے دس مثنویاں لکھی ہیں، لیکن عام طور پر ان کی تین مثنویوں کے نام معلوم ہیں:

(۱) چمنستان

(۲) شکرستان (نثر) یہ گلستان کی طرز پر لکھی گئی ہے اور ان کی یادگار کتاب مانی جاتی ہے۔

(۳) سحر حلال کے رنگ میں ایک مثنوی لکھی ہے۔

بھگوان داس ہندی نے لکھا ہے کہ ان کے کہنے پر منت نے قصہ ''چندر ہانس'' پر مبنی ایک مثنوی لکھنی شروع کی تھی مگر عمر نے وفا نہ کی اور مثنوی ناتمام رہ گئی۔

غزل: غزلوں کی صحیح تعداد تو نہیں معلوم، لیکن ان کے اشعار کی تعداد ۳۰ ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔

قصیدہ: سو کے قریب

رباعی: پانچ سو

خمسہ: نظامی کے خمسہ کے جواب میں خمسہ بھی لکھا تھا۔

تذکروں میں منت کا ذکر بحیثیت ایک اردو شاعر کے ملتا ہے، اس لیے تذکروں میں اردو اشعار ہی کے نمونے زیادہ ملتے ہیں، فارسی کے نہیں۔ یہاں تک کہ فارسی تذکرہ ''صحف ابراہیم'' میں بھی کوئی شعر نقل نہیں کیا گیا ہے اور ''سفینہ ہندی'' میں صرف ایک شعر دیا گیا ہے۔

''نشترِ عشق'' میں ان کی مثنوی شکرستان میں جو گلستان سعدی کی طرز پر لکھی گئی ہے، کافی اشعار درج کیے گئے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

علی ای شور عشقت رونق میخانہ دلہا
زلالی بادہ مہر تو، پای عقل در گلہا

☆☆☆

آن شنیدی کہ عارفی بگذشت
بامدادان بسوی مارستان

☆☆☆

مطرب عشق این دمد درنی
نی الکائنات غیر ک شی

☆☆☆

مولوی شیخ کرامت علی اعجاؔز نارنولی

حافظ حاجی امام کے چوتھے فرزند کرامت علی متخلص بہ اعجاؔز، نارنول کے رہنے والے تھے۔ شیخ فاروقی الاسدی اور مذہباً سنی حنفی تھے۔

وہ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) میں نارنول میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کتابیں اپنے والد بزرگوار سے پڑھیں اور پھر جے پور پہنچ کر معقولات اور منقولات کی تکمیل کر کے مولانا تسلیم نارنولی (۱۸۴۰-۱۸۸۵) سے دستار فضیلت سے سرفراز ہوئے۔ مولانا تسلیم سے ان کی قرابت بھی تھی۔ چونکہ انھوں نے طب کی سند بھی حاصل کر لی تھی، اس لیے ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد بزمرہ اطبا سرکاری فوج میں ملازمت کر لی ۔ چندے بعد یہ ملازمت ترک کر کے ۱۷ دسمبر ۱۸۶۹ء کو نوبل اسکول جے پور میں مدرس ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد جے پور ہی میں فارسی اور عربی کے پروفیسر ہو گئے۔ جب ۱۸۸۵ء میں مولانا تسلیم کی وفات ہوئی تو یہ ان کی جگہ مفتی ریاست کے عہدۂ جلیلہ پر مقرر کر دیے گئے۔

فن شاعری میں بھی ان کو مولانا تسلیم ہی سے تلمذ تھا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی ۔ دونوں پر یکساں عبور حاصل تھا اور عالمانہ وقار کے ساتھ فن کو بحیثیت فن استعمال کیا، کبھی کسی امیر اور رئیس کی شان میں کچھ نہیں لکھا۔

فارسی تصانیف:

حفظ السیر: فارسی مثنوی (متعلق بہ سیرت پاک) ۱۹۲۰
دیوان فارسی:
مناظرِ عقل ہوس- نثر فارسی ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء)
آوان الاذان فی الاذان- نثر فارسی ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۴ء)
رسالہ در بیان جمعہ- نثر فارسی
انھوں نے ۸ محرم ۱۳۱۴ (۲۰ جون ۱۸۹۶ء) کو وفات پائی۔
فارسی کلام کا نمونہ نہ مل سکا۔

گھمنڈی لال عاشق حصاری

ریاست جے پور میں ملازم تھے۔ ذی استعداد منشی اور شاعر تھے۔ زیادہ تر فارسی میں کہتے تھے۔ لیکن افسوس کہ نہ اس سے زیادہ حالات معلوم ہو سکے نہ کلام کا نمونہ مل سکا۔

گیان رائے ہنر جھجھری

ان کے آباو اجداد جھجھر کے رہنے والے تھے جو دلی سے ۳۵ کلومیٹر دور مغرب میں واقع ہے، لیکن گیان رائے ۱۱۲۸ھ (۱۷۱۵ء) میں دولت آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سب سے پہلے قلیچ خان بہادر کی خدمت میں رہے اور بعد میں سید عالم علی خان، برادر زادہ سید حسین علی خان کے یہاں منشی گری پر مامور ہوئے۔ یہیں سے وہ نواب آصف جاہ کی خدمت میں پہنچے۔ بعض لوگوں نے ۱۱۴۸ھ[1] (۱۷۳۵ء) میں ان کے والد کو زہر دے کر مار ڈالا۔ رفیق پرور نواب نے گیان رائے کو بلایا اور ان کے باپ کی جگہ ان کو دے دی اور اپنے فرزند نظام الدولہ (ناصر جنگ شہید) کے ساتھ شاہجہان آباد بھیج دیا۔ نظام الدولہ تو جلد ہی اورنگ آباد واپس چلے گئے لیکن ہنر سفر کا کوئی معقول انتظام نہ ہونے کے باعث مجبوراً شاہجہاں آباد ہی میں رہ گئے۔ جب حالات کچھ سازگار ہوئے تو یہ بھی آکر پھر نظام الدولہ کی خدمت میں تعین ہو گئے اور بہت عرصے تک ان کے ساتھ رہے۔ نوکری سے مستعفی ہو کر اورنگ آباد ہی میں خانہ نشینی اختیار کر لی۔ میر غلام علی آزاد کے شاگردوں میں سے تھے۹

---

[1] ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹ء: گل رعنا: ۱۸۱

رمضان ۱۱۷۰ھ[1] (۲۸ مئی ۱۷۶۵ء) کو اورنگ آباد میں وفات پائی۔ گل رعنا کے مؤلف شفیق نے قطعہ تاریخ وفات کہا ہے۔

مرد در تاسع ماہ رمضان	شاعر ماہر معنی پرواز
سال فوتش بقلم داد شفیق	کرد رحلت ہنر بی انباز

ہنر کے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں:

دوش در آئینہ تمثال رخ یار افتاد	آنقدر آب شد از شرم کہ از کار افتاد
صور تگر، جمال تو چون اہتمام کرد	رنگی کہ داشت در قلمِ خود، تمام کرد
سیہ پوشید سنبل دید چون حال پریشانم	ندانم مشکین کرا یارب نظر کردم
رفتہ ام دیوانہ زیر خاک و ہرگز کس نکرد	از شرار سنگ طفلان شمع تربت روشنم

آزاد بلگرامی ہی نے گیان رائے کو ہنر تخلص تجویز کیا تھا۔

لہٰذا ہنر کہتے ہیں:

عیبم بہ ہنر گزید آزاد	از نقص کمال دید آزاد
نگرفت کسی خزف بہ یاقوت	قطرہ بہ گوہر خرید آزاد
عنقای نشان ندیدہ را	دردام نشان کشید آزاد
فیضم ز حسن رسید و فرمود	اصلاحِ سخن مزید آزاد
از لطف تخلصم ہنر کرد	افسون کرم دمید آزاد

شاہ لطف اللہ انبالوی

شاہ لطف اللہ انبالوی، شاہ بھیک چشتی لاہوری کے مرید اور صاحب علم و عمل تھے۔ اپنے مرشد کے خرق عادات اور کرامات کے ذکر میں "ثمرۃ الفواد" تالیف کی۔ ۱۱۸۶ھ (۷۳-۱۷۷۲ء) میں انتقال ہوا۔

قطعہ تاریخ انتقال شاہ لطف اللہ انبالوی۔

عارفی بود شاہ لطف اللہ	چشتی دشہ سوار اسپ و دود
پیرا و شاہ بھیک چشتی نیک	فرس عشق آنکہ تیز ربود

---

[1] ۹ رمضان ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء: گل رعنا: ۱۸۱

روز شنبہ بہ بستم ذی قعدہ   اجلش برد سوی حق خوشنود
خیر مقدم بگفت رضوانش   در بہشت بریں بیا فرمود

اشعار کے نمونے نہ مل سکے۔

لطیفن زہرہ کرنال

کرنال کی طوائفوں میں سے تھی۔ مولوی ظہور علی صاحب متخلص بہ ''ظہور'' مغفوری دہلوی مدرس اول (فارسی) ضلع اسکول ریواڑی سے شعر پر اصلاح لیتی تھی۔

تذکروں میں اس کی قابلیت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ فارسی زبان اور اس کے قواعد سے خوب واقف تھی اور بامحاورہ گفتگو کر سکتی تھی۔ ہزار دو ہزار آدمیوں میں مستثنیٰ تھی۔

غدر کے بعد دلی آئی اور لطیفن کے بجائے لطیف[1] جان نام رکھ لیا اور زہرہ تخلص۔ فارسی میں غزلیں کہتی تھی۔ ۱۸۵۷ء[2] میں وفات پائی۔ دیوان نہیں چھپا۔ افسوس کہ فارسی اشعار کے نمونے نہ مل سکے۔

محبوب علی شاہ اصغری کرنالی

کرنال قصبے کے رہنے والے تھے۔ تذکرہ ''سخنوران چشم دیدہ'' کے مصنف ترک علی شاہ ترکی قلندر اصغری سے غدر ۱۸۵۷ سے پہلے انبالہ شہر میں ملے تھے۔ اس وقت یہ نوجوان تھے اور ہر زبان میں شعر کہتے تھے۔ علم رمل میں بھی مہارت حاصل تھی اور اس موضوع پر ''محبوب الرمل'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ ان کا فارسی کا صرف ایک شعر ملا۔

لائق فضل تو ام ، قابلِ عدلِ تو نیم   ای خطاء پوش خطا پوش، بس اَرحم اَرحم

☆☆☆

---

[1] ادب لطیف یعنی عورتوں کی شاعری: ۷۷

[2] ۱۳۹۳ھ/۱۸۷۵ء میں وفات پائی: تذکرۃ الخواتین: ۶۹

محمد افضل قادری پانی پتی

ان کا پورا نام قادری محمد افضل تھا اور یہ قاضی عبدالحمید کے فرزند تھے جو اپنے زمانہ کے عالم و فاضل گذرے ہیں۔ مولانا قادری کے اجداد شیخ امان اللہ بھی جید عالم صوفی اور درویش تھے۔ پانی پت کے اطراف میں بہت لوگ شیخ موصوف کے مرید اور معتقد تھے۔ قادری شاعری میں قدیم شعرا کے پیرو تھے۔ ان کی شاعری جذبات عاشقانہ و عارفانہ کا مجموعہ تھی۔

۱۰۲۴ھ (۱۶۱۵ء) میں برہان پور گئے اور خان اعظم کے زمرۂ ملازمین میں شامل ہو گئے۔ خان ممدوح کی تعریف میں جو قصائد لکھے ہیں بلندی تخیل، حسن بلاغت اور جدتِ بیان کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔ قادری مدت دراز تک خان موصوف کے دامنِ دولت ہی سے وابستہ اور انعام و اکرام سے بہرہ ور ہوتے رہے۔

انھوں نے فارسی زبان میں قصیدے، غزلیں اور رباعیاں کہیں۔ نمونے کے طور پر ایک قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

باز وقت است کہ در عرصۂ پامال خزاں — نو بہارِ ظفرِ شاہ نماید جولاں
نغمہ فتح و ظفر ساز دہد بی شبہ — بر سر سرو علم فاختہ خوش الحان
خور نشان گردد ماہ علم از تابش تیغ — گل فشان گردد باد ظفر از شاخ کمان
ملک رابار دگر تازگی دست دہد — بر لب جوی جفر شاخ زند شاخ کمان
باد برّندہ شود اسب بگاہ پویہ — شیر درندہ شود مرد بگاہ جولان
خان خاناں کہ بتعظیم بزرگیش ملک — باز گیرد چو کواکب حرکات از دوران
درنہادش اثر مردی و آثار قبول — ہچوں با چرخ نجوم است و چوں ہر تواں
ز آنچہ پرسی خبرت باز دہد گفتن من — لوح محفوظ ہمی دارد بر جای زباں
ای کہ چوں تو نتواں بود بروئ گیتی — وی کہ چوں تو نبود زیر سپہر گرداں
روز بزم تو ندیماں ہمہ موج دریا — روز رزم تو سواراں ہمہ گرد میداں
روز رزم تو کہ آن روز نشان اجل است — ہر کہ آمد زپی جنگ تو بربستہ میاں
آن چنان تیغ تو شد بار میانش کہ نشد — دست عاشق بہ میاں بت مشکین چوگان

گاہ کیں تازی و ہنگام سبکتازی تو | آسمان باز بگر داند از راہ عنان
واں کمند تو کہ بر گردن بد خواہ زند | دست تدبیر پی مصلحت ملک رواں
از تف تیغ تو دشمن نتواند رستن | فی المثل گر چو سمندر شود آتش خفتان
آن دلیری تو کہ در روزگراں سایۂ تو | بزمین در شود از بیم ہمی کوہ گراں

(درج بالا مذکور اشعار اس طویل قصیدے سے ہیں جو قادری نے خان خاناں کی مدح میں کہا تھا)

خان خاناں کے انعام والطاف کا اعتراف یوں کیا ہے۔

باز چوں گر دوں بساماں می روم | ہمچو دریا دُر بداماں می روم
مژدہ بادای دوستان کز فیض بحر | دُر فشان چوں ابر نسیاں می روم
دامنی پر از گل وریحاں تو | چوں صبا از سیر بستان می روم
باز پرس از من کہ از جود کدام | این چنین شاداں و خنداں می روم
کاں بحسبیب و بحر در دامن رواں | از عطای خان خاناں می روم
من از اندک جود اوچوں آفتاب | تا بمغربؔ گوہر افشاں می روم

رباعیات:

ای کز درت آفتاب خواہد زنہار | پیوستہ در و سپر باشد دوار
درگاہ تو کعبہ ہست و ما زوّاریم | زوار از کعبہ باز گردد ناچار

☆☆☆

محمد بیگ محوی ریواڑوی

ریواڑی کے رہنے والے تھے۔ خوش ترکیب، خوش زبان، بلند فکر اور سلیم طبع۔ مدتوں زمرۂ طلبا سے مدرسہ شاہجہاں آباد میں منسلک اور رزور استعداد سے اماثل وقرآن سے ممتاز رہے۔ نظم ونثر فارسی میں دستگاہ تمام رکھتے تھے۔

محوی دلی سے بتلاشِ معاش جے پور پہنچے اور وہاں ملازم ہو گئے۔ مختلف خدمات ان کے سپرد ہوئیں ۔سرکاری مطبع کے منیجر بھی رہے اور پھر صدر فوجداری میں سر رشتہ دار ہو گئے۔ جے پور ہی میں انتقال کیا۔

''تذکرہ شعرائے جے پور کے مصنف احترام الدین شاغل نے محوی کا دیوانِ فارسی، مثنویات

فارسی، مجموعۂ مضامین فارسی (منشی نعیم الدین خان انسپکٹر ایکسائز، ریاست جے پور کے یہاں) دیکھے تھے۔
ان کے چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

چون زلفِ تاب خوردۂ خورشید عارضان   دارد ہزار صبح در آغوش شام ما
محوی چو بگذری سوے گلزار عرض کن   با عندلیب عشق و قمری سلام ما

☆☆☆

ساغر بنوشی برلبِ آبِ رواں کہ عمر   بیش از دمی نگشت میسر حباب را

☆☆☆

مہر ماز نجیر شد موجی کہ صبح   از نسیم افتاد بالای شراب

☆☆☆

زحد برستم ای بی وفا کہ در بردل   باین ضعیفی تن نالۂ رسائی ہست
بیا بکش کہ شہیدان تیغ جور ترا   بناز تست اگر میل خوں بہائی ہست
زحالِ محویِ آزردہ دل چہ می پرسی   جگر فگار ستم دیدہ بی نوای ہست

☆☆☆

بر ماچہ جفا ہا کہ تو صیاد نکردی   شد فصلِ بہار آخر و آزاد نکردی
کی بر سرِ حاکم نگذشتی کہ تو ظالم   جولان نزدی بروی برباد نکردی
دیگر کہ در آید بفریب تو کہ محوی   از دستِ غمت مردو گہش یاد نکردی

☆☆☆

محمد جعفر خان راغبؔ پانی پتی

قاضی خواجہ ملک علی کا آبائی وطن ہرات تھا۔ ہرات پر چنگیز خان کا تسلط ہو جانے کے بعد خواجہ ملک علی وہاں کی سکونت ترک کر کے ہندوستان چلے آئے۔ اس وقت یہاں غیاث الدین بلبن (۶۶۴-۶۸۴ھ/ ۱۲۶۶-۱۲۸۵ء) حاکم تھا۔ ہندوستان پہنچنے پر حضرت شرف الدین بوعلی قلندر کے مشورے پر وہ پانی پت چلے گئے اور وہیں بس گئے۔ خواجہ ملک علی کے خاندان کے ایک شخص خواجہ عبدالرزاق کا نکاح نصرت خان جہانگیری کی دختر نیک اختر سے ہوا، جن کے بطن سے تین لڑکے ہوئے۔ (۱) خواجہ عبداللہ معین الدولہ دلیر خان نصیر جنگ (م:

۱۱۴۷ھ/۱۷۳۴ء) (۲) شمس الدولہ لطف اللہ خان صادق نیک نام متہور جنگ (م: ۱۸ رمضان ۱۱۶۶ھ/۲۰ جولائی ۱۷۵۳ء)، (۳) شکر اللہ عزت الدولہ (م: ۱۲ ربیع الاول ۱۱۴۳ھ/۱۴ ستمبر ۱۷۳۰ء)۔ عبدالرزاق کا ایک چوتھا بیٹا، شیر افگن[1] (م: ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۶ء) بھی تھا۔

عبدالرازق کے دوسرے بیٹے لطف اللہ خان صادق کے چھ لڑکے ہوئے، (۱) عنایت خان راسخ (۲) ہدایت اللہ خان (۳) فاخر خان (۴) شاکر خان (۵) محمد ابراہیم (٦) ناصرالدین خان (ان کا ایک اور لڑکا جمال الدین کے نام سے بھی بتایا جاتا ہے۔)

لطف اللہ خان صادق کے بیٹے ہدایت اللہ خان کا نکاح اپنے چچا شکر اللہ خان عزت الدولہ کی لڑکی سے ہوا۔ محمد جعفر راغب، ہدایت اللہ خان ہی کے فرزند تھے[2]۔ ان کے ایک بھائی محمد علی انصاری، مولف ''تاریخ مظفری'' بھی تھے۔

محمد جعفر خان راغب ۱۱۵٦ھ (۱۷۴۳ء) میں دلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے طبیعت موزوں کلام کی طرف مائل تھی۔ جب احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا اور دلی آپہنچا، تو دلی کے حالات خراب ہو گئے۔ راغب ۱۱۷۰ھ (۱۷۵٦ء) میں دلی کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ پہنچے اور وہاں مرزا فاخر مکین (م: ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۸ء) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

لکھنؤ کے چند روزہ قیام کے بعد وہ عازم عظیم آباد (پٹنہ) ہوئے اور پھر وہیں کے مستقل متوطن ہو گئے۔ ان کے دادا لطف اللہ خان کی وہاں جایداد تھی۔ راغب اس کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ مگر شعر گوئی کی مشق میں خلل نہ آنے دیا۔ وہاں سے اپنا کلام اپنے استاد مکین کے پاس بھیجتے رہتے تھے اور جب اصلاح ہو کر واپس آجاتا تو دیوان میں درج کر لیتے۔ فارسی اور اردو کے دیوان گلزار جعفری، زر جعفری، بہار جعفری ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳) ہیں

راغب نے ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء) میں عظیم آباد میں وفات پائی۔

یہ چند اشعار ان کے ہیں:

جلوہ گر بر لب بام آن مہ تاباں شدہ است — باز بالای فلک مہر نمایاں شدہ است

☆☆☆

---

[1] یہ شاید کسی دوسری بیوی سے ہونگے۔

[2] یادگار شعرا (ص: ۸۰) طبقات الشعرائے ہند (ص: ۲۴٦) اور گلشن سخن (ص: ۱۳۵) میں راغب کو لطف اللہ خان کا بھتیجا لکھا ہے۔

صبر کجا، شکیب کو، عاشق مبتلای را تا نکند بہجر تو گریۂ ہای ہای را

☆☆☆

گوش نما ویا دکن[1] بہر خدای پندِ ما بادۂ سرکشی منوش، ای بتِ خود پسند ما

☆☆☆

مگر آن ترکِ کافر کیش، قصدِ امتحان دارد کہ بامن ذکر تیغ و تیر و خنجر درمیاں دارد

☆☆☆

خندہ بر گریہ ما آن گل رعنا میکرد خون نا ریختہ از ناز تماشا میکرد

☆☆☆

دل چو گردد برطرف یکجا نشستن مشکلست تا ہوس در سر بود یارا شکستن مشکلست

☆☆☆

زسوز عشقِ او از بس فتاد آتش بجانِ ما برنگ شمع ہر شب سوخت مغزِ استخوان ما

☆☆☆

ای دل !طپیدن تا کجا، ای دیدہ زاری تا بکی این بیقراری تا بچند، این اشکباری تا بکی

☆☆☆

دی دود رواں بود ز خاکستر راغب امروز چنان سوخت کز وہم اثری نیست

☆☆☆

خواجہ محمد عاقل سونی پتی

یہ احمد جام زندہ پیل کے خاندان سے تھے۔ ان کے اجداد قصبہ سونی پت میں جو پایہ تخت دلی کے مضافات میں ہے، متوطن ہوئے۔

عاقل سونی پت ہی میں پیدا ہوئے۔ جب بالغ ہوئے اور محمد شاہ (۱۷۱۹-۱۷۴۸ء) کی ملازمت کے دوران ان کی شہرت آسمان کو چھونے لگی تو گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ نظم میں حکیم شہرت (۱۱۴۹ھ/۱۷۳۶ء)

---

[1] باغ معانی:۷۹: گیر

سے اصلاح لی۔ ان کے علاوہ سراج الدین علیخان آرزو (۱۱۶۹ھ/۱۷۵۵ء) سے بھی ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ بھاکا اور اشلوک لکھنے میں بھی ان کو خوب مہارت حاصل تھی۔ ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء) میں وفات پائی۔ فارسی میں مرات الخیال (مثنوی) ان کی تصنیف ہے۔

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

امروز سرِ زلفِ تو وردست رقیب است　　　ای وای کہ این قرعہ بنام دگر افتاد

☆☆☆

بصحرا ایکہ گردیدم شہید ناز خوش چشمان　　　چراغان ست از چشمِ غزالان بر مزارِ منِ

☆☆☆

بہ چشمِ خوش بہم پیوست ابروی بہ ابدوئی　　　بدان ماند کہ در جنگ ست آہوی با آہوی

☆☆☆

قاضی محمد عمر روحیؔ انبالوی

قاضی محمد عمر روحی تقریباً ۱۸۷۹ء میں انبالہ میں پیدا ہوئے۔ حصول تعلیم کے بعد جب شعر گوئی کا شوق لاحق ہوا تو اپنے زمانے کے اردو کے مشہور اور معروف شاعر داغؔ دہلوی (۱۸۳۱-۱۹۰۵ء) کے سامنے زانو تلمذ تہ کیا۔ اور شعر گوئی میں مہارت اور شہرت حاصل کی۔ فارسی میں ایک دیوان یادگار ہے، جسے اشاعت کے مرحلے تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا۔ اس کا قلمی نسخہ ان کے بیٹے کے پاس محفوظ تھا۔ قصیدہ گوئی کا خاص ملکہ رکھتے تھے۔ ۱۹۰۷ء میں وفات پائی۔

کلام کا نمونہ یہ ہے:

غلغلہ اندازم اندر قدسیان　　　روز خون بر خاور ستان می زنم
بادلِ صدداغ عشق سر مدی　　　سکہ در ملکش سلیمان می زنم
گر بنا لم در دلِ شبہای ناز　　　غوطہ ہا در آب حیوان می زنم

☆☆☆

مولوی محمد عین الدین مسرورؔ رہتک

ان کے والد محترم کا نام غلام مسرور صدیقی تھا۔ ان کے جد اعلیٰ قاضی قیام الدین حکومت یمن میں اعلیٰ عہدے پر مامور تھے۔ وہاں سے جب ان کا دل اکتا گیا تو سیستان چلے گئے اور کچھ دن وہاں ٹھہرنے کے بعد ہندوستان کا رخ کیا اور دہلی سے ۴۰ میل دور قصبہ رہتک میں جا بسے۔ قلعہ رہتک کے صدیقیان ان ہی کی اولاد میں سے ہیں۔

مولوی محمد عین الدین رہتک ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ مولوی حافظ امام الدین الحاج رہتکی کی خدمت میں تحصیل علم و فضل کی منازل طے کی دینی تعلیمات دوسرے حضرات سے حاصل کیں۔ جب یہ پڑھ لکھ گئے تو بھوپال کے حاکم نے ان کو تھانیداری کے عہدے پر مامور فرمایا اور پھر بعد میں وہیں پر تحصیلدار بنا دیئے گئے۔ ان کے بڑے بھائی منشی صلاح الدین بھی بھوپال کی فوج میں تھے۔

مسرور کو شعر و شاعری کا شروع ہی سے شوق تھا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ نمونہ کے طور پر ان کے چند فارسی اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

صراحی کردن خون ریختہ امشب بط مل را　　　تصور کردہ شور عشق خود آواز قلقل را
بدور آن مسلسل حلقہ ہای زلف اوبنگر　　　محال ای فلسفہ عارض نشد دور وتسلسل را

☆☆☆

از بر من چو دلر با بر خاست　　　از دلم آہ و نالہ ہا بر خاست
رفت در باغ آن گل خندان　　　غنچگی از شگوفہ ہا بر خاست

☆☆☆

ہرچند در گلشن روم چون غنچہ کی خندان شوم　　　کز بہر تفریح دلم باغ وفضای دیگر ست
مسرورؔ بر حال جہاں غرہ مشو چون کو دکان　　　کا مروز از آن تست آن فردابرای دیگر ست

☆☆☆

کان دُرو لعل بین دو چشم　　　گر بُع تو مائل زر افتاد
نیستم خام کہ از شعلہ نخشمت ترسم　　　پختہ در آتش عشقت دل بریاں کردم

☆☆☆

مرزا محمد قتیل فرید آبادی

یہ نومسلم تھے۔ اصلی نام دیوانی سنگھ تھا۔ بعد میں یہ محمد باقر شہید اصفہانی کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے اور ان کے تخلص کی رعایت سے قتیل اختیار کر لیا۔ یہ بات مدتوں بحث کا موضوع رہی ہے کہ قتیل فرید آباد کے رہنے والے تھے یا نہیں؟ اور اس پر کافی تحقیق ہوئی ہے جس سے الگ الگ نتیجے سامنے آئے ہیں۔

جناب مالک رام کا کہنا ہے کہ وہ بٹالہ (ضلع گورداس پور، پنجاب) کے رہنے والے تھے، جہاں سے ان کے دادا رائے لعل جی مل نے نقل مکانی کیا۔

اسد علی انوری (مصنف قتیل اور غالب) کے بیان کے مطابق ان کے خاندان کے جو افراد فرید آباد میں موجود ہیں، ان کے پاس خاندان کا شجرۂ نسب موجود ہے، جو درگاہی مل (قتیل کے والد) پر ختم ہو جاتا ہے۔

''نشتر عشق'' کے مصنف آغا حسین قلی خان عاشقی عظم آبادی قتیل کی پیدائش کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ ۱۱۷۲ھ (۱۷۵۸-۵۹ء) میں شاہجہان آباد میں پیدا ہوئے۔ غالب قتیل کو ہمیشہ فرید آبادی کہتے رہے۔

سفینہ ہندی کے مصنف بھگوان داس ہندی لکھتے ہیں کہ قتیل کے والد پٹیالہ میں متوطن تھے اور خود قتیل شاہجہان آباد میں پیدا ہوئے۔

قتیل کو فرید آبادی ماننے سے پروفیسر مختار الدین احمد نے بھی انکار کیا ہے۔ انھوں نے مختلف ماخذ سے یہ ثابت کیا ہے کہ قتیل دلی میں پیدا ہوا اور کسی نے یہ نہیں کہا ہے کہ وہ فرید آباد کا رہنے والا تھا۔ اس صورت میں اسے دلی کا ہی، یعنی دہلوی کہنا چاہیے۔

لیکن مرزا غالب قتیل کو ہمیشہ فرید آبادی کہتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں جناب مالک رام فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں فرید آباد کی دلی کے مضافات میں ہونے کے باعث دلی ہی کا ایک حصہ اور محلہ شمار کیا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قتیل فرید آباد میں رہتے تھے اور مضافاتِ شہر میں مقیم ہونے کے باعث عرف عام میں دہلوی کہلائے۔ آگے فرماتے ہیں کہ غالب نے البتہ اسے فرید آبادی کہہ کر اسکی تضحیک اور ہتک کرنا چاہی ہے۔ وہ یہ اثر پیدا کرنا چاہتے تھے کہ قتیل دہلوی نہیں بلکہ ایک بیرونی بستی کا رہنے والا تھا۔ اس لے گنوار اور غیر مستند تھا۔

''تذکرۂ نتائج الافکار'' کے مصنف، ''قدرت اللہ گوپاموی'' نے قتیل کو لاہوری بتایا ہے۔

قتیل کی سکونت کو لے کر تذکرہ نویسوں میں اختلاف رائے ضرور ہے، مگر اس بات پر سب متفق ہیں

کہ علوم عربیہ وفارسیہ میں ان کے ذہن رسا نے کافی استعداد حاصل کی وفن سخن میں بڑی مہارت پیدا کی۔ اپنے عہد کے ملک الشعرا تھے۔ معنی بیگانہ کی تلاش میں ان کی طبع رسا تھی اور ان کی فکر فصیح البیان شعرا کی ہمنوا۔ ان کے کلام شیرین کی لطافت، وادی سخن کے تشنہ لبوں کے لیے آب حیات اور ان کے گفتار کی مٹھاس رشک قند و نبات۔ ان کے فارسی کے دو دیوان ''بحر الفصاحت'' اور ''چہار شربت'' ان کی علمی لیاقت کے گواہ ہیں۔

قتیل آزاد منش آدمی تھے۔ تمام عمر شادی نہیں کی۔ اپنے حسن کلام اور حسن اخلاق کی وجہ سے بہت ہر دل عزیز تھے۔ نواب سعادت علی خان ان کے سرپرست تھے۔ قتیل نے ۱۲۳۳ھ[1] (۱۸۱۷ء) میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ وہیں قیصر باغ میں دفن ہوئے جہاں آج کل میوزک کالج بنا ہوا ہے۔

نمونے کے طور پر ان کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

بر سرم خاکم چوشب آن شمع بزم آرا گذشت
شعلۂ جست از دلم، کز عالم بالا گذشت

☆☆☆

من رسم و رہ زہد ندانم چہ تواں کرد
ترک رخ نیکو نتوانم چہ تواں کرد

☆☆☆

ہمہ صحرا پر از شور وفغانست
ہمانا محملی در کارواں است

☆☆☆

بز مرگ کی سودم دہد امشب مداوای دگر
این شب مداں ای ہمنیش مانند شبہای دگر

☆☆☆

جز اینکہ در کفِ خود رنگی از حنا داری
نوشتہ ای بنما گر بخون ما داری
چگونہ پای بروی زمین نہی زغرور
دلِ بلا کشِ عاشق بزیر پا داری

☆☆☆

---

[1] نتائج الافکار میں ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ء) ہے: ص:۴۲ مطلع انوار۔ ۱۳ جنوری ۱۸۱۸: ص:۵۱۶

محمد وحید الزماں سیماب رہتکی

سیماب رہتکی ۱۹۰۷ میں روہتک میں پیدا ہوئے اور وہیں سے منشی عالم کی تعلیم پائی۔ یہ فارسی اور اردو کے پختہ شاعر تھے۔قومی تحریک میں بھی خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔قومی موضوعات پر خوب قلم فرسائی کی ہے۔

فارسی اشعار نہیں مل سکے۔

مولوی محمد بسمل تھانیسری

یہ اپنے معروف لقب میاں صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ یہ ۱۱۲۶ھ (۱۷۱۴ء) میں پیدا اور ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۴ء) میں فوت ہوئے۔ان کی شہرت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اکثر تذکروں میں ان کا ذکر مل جاتا ہے۔ مجموعہ نغز کے راقم میر قدرت اللہ قاسم ان کے شاگردوں میں سے تھے۔بسمل بڑے محقق اور دانشمند انسان تھے۔علوم شرعیہ کے فاضل، منقولات میں کامل اور معقولات سے بقدر ضرورت واقفیت رکھتے تھے۔عربی کتابوں کا درس بھی دیتے تھے۔ مولانا فخر الدین دہلوی کے دوستوں میں سے تھے اور ان کے مدرسے کے کل اُستادانِ بزرگ انھی کے شاگرد تھے۔

فارسی اور ریختہ دونوں میں شعر کہتے تھے اور دونوں ہی میں دیوان ترتیب دیے۔افسوس کے فارسی کلام کا نمونہ نہ مل سکا۔

مختی (عیشی) حصاری

''طبقات شاہجہانی'' میں ان کا تخلص مختی حصاری دیا ہے اور ''صبح گلشن'' اور ''سرہند میں فارسی ادب'' میں عیشی حصاری۔ دراصل پہلے تخلص مختی حصاری ہی تھا جسے بعد میں بدل کر عیشی کر دیا گیا۔

ان کا اصلی وطن قم (ایران) تھا' جہاں سے یہ ہندوستان آئے۔ یہاں دلی کے بعض مدرسوں میں سر گرم تحصیل علم رہے۔ فارغ التحصیل ہو کر، آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے پادشاہ وقت جلال الدین محمد اکبر (

۱۵۵۶-۱۶۰۵ء) کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی۔ اکبر نے انھیں سرہند کا قاضی مقرر کرتے ہوئے فرمایا'' اب ہم تمہارے کندھوں سے محنت کا بوجھ اتار کر تمہارا تخلص عیشی رکھتے ہیں''، عیش نے سرہند ہی میں وفات پائی۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دلِ شکستۂ ماہم در آن میاں گم شد　　بفکر موی میانت دلکشاں گم شد

بخشک ساختن صفحہ خاک بر دارند　　زمین عدم شود ار د ر کتابت فصلش

فغاں زخلق بر آمد کہ آفتاب گرفت　　سحر چو روی خود آنماہ در نقاب گرفت

☆☆☆

شیخ معین الدین صبور نارنولی

ان کے والد کا نام شیخ محب اللہ تھا۔ ان کا اصلی وطن نارنول کے نزدیک ایک قصبہ تھا۔ بعد میں قبائل اور خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ نقل مکان کر کے شاہجہاں آباد چلے گئے۔ انگریزی فوجیوں کو فارسی پڑھانے کا شغل کرتے تھے۔ اس تقریب سے اطراف ہندوستان کا سفر اختیار کیا۔ سنجیدہ اور موزون طبع تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

در پیچ و خم کوچۂ گیسوی تو، بر دل

از کشمکش شانہ چگویم کہ چہار فت

☆☆☆

ملا نسبتی تھانیسری

ملا نسبتی تھانیسری، جہانگیر (۱۶۰۵-۱۶۲۷ء) اور شاہجہاں (۱۶۲۷-۱۶۵۸ء) کے زمانے میں بقید حیات تھے۔ درویشانہ اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ عمل صالح کے مصنف محمد صالح کنبوہ نے ۱۰۶۲ھ (۱۶۵۱ء) میں لاہور سے آتے وقت تھانیسر میں ان کی زیارت کی تھی۔ وہ لکھتا ہے:

''نسبتی کا سخن کے اعتبار سے برگزیدہ اور اہل معنی میں شمار ہوتا تھا مہر اور محبت کا مجسمہ اور سرتاپا درد اور سوز سے شرابور تھا۔ باتیں اس کی دلچسپ اور جوش اور جذبے سے مملو ہوتی تھیں

اور گفتار ہوش ربا اور دلفریب''

وہ آگے لکھتا ہے:

''بندہ چون بہ تھانیسر رسید بتکیہ آن نمد پوش رفت حالی قالی فرستاد و خود نیز مانند مصرع بہ بی تکلفی تمام در رسید و چون مغنی بلند بر زمین سخن نشست و معنی خاک نہادی را باز نمود۔ ظاہر شدہ کہ شیوہ آن صاحب باطن ہمین بودہ''

اپنے آبدار شعر نہایت ہی موثر طریقہ سے پڑھتے تھے، یہاں تک کہ سامعین کی آنکھوں سے اشک بہنے لگتے تھے۔ ان دنوں ایک ''مخزن اسرار'' جیسی مثنوی اپنے پاس رکھتے تھے۔ بعض شعر اس میں سے سناتے تھے اور شعر کو حد درجے درد اور سوز سے پڑھتے اور پڑھنے کے دوران آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے۔ یہ روشن ضمیر ہمیشہ کمبل اوڑھتے تھے۔ اہل دنیا کے لباس کو کبھی نہیں اپنایا۔ ۱۰۷۳ھ (۱۶۶۲ء) میں وفات پائی۔

یہ طرز قدیم کے پختہ شاعر تھے۔ چھ ہزار فارسی اشعار پر مشتمل ایک دیوان ان سے یادگار ہے۔ ان کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم ز دل وزدیدہ صبرو ہم دل دیوانہ را
دزدمن باخانہ می وزدد متاع خانہ را
چوں پی دل بر دن آمد عقل را اولی ربود
دزد دانا می کشد اول چراغ خانہ را

☆☆☆

بسر زد یا بدل زد یا بپازد
نمی دانم محبت بر کجازد
زاول سعی بیجا کرد فرہاد
ہماں یک تیشہ آخر بجازد

☆☆☆

زسوز دل افسانہ می نویسم
بہ پروانہ پروانہ می نویسم
بدل می نویسم چہ خواہم نوشتن
کتابت بہ دیوانہ می نویسم

☆☆☆

بیرون نیامدہ ام ہیچ گہ زخانہ خویش
سفر چہ داند عنقا ز آشیانۂ خویش
نمی پرم زپر و بال عاریت چوں تیر
نشستہ ام چو کمان روز و شب بخانہ خویش

☆☆☆

درپردہ خاک نغمہ ہست بسی   آنگہ شنوی کہ گوش بر خاک نہی

☆☆☆

شیخ نظام الدین ضمری سفیدونی

شیخ نظام الدین بلگرام کے رؤسا میں سے تھے۔ان کا وہاں کے محلہ قاضی پور میں قیام تھا۔بچپن میں والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو ان کے چچا شیخ سلیمان اکبری ان کو اپنے ساتھ سفیدوں لے گئے اور پوری توجہ کے ساتھ ان کی پرورش کی۔۱۰۰۳ھ(۱۵۹۴ء) میں سفیدوں ہی میں وفات پائی۔مبارک خان دہلوی نے قطعہ تاریخ وفات لکھا''خردم گفت آہ آہ نظام'' مادہ تاریخ ہے۔

ضمیری کا فارسی دیوان ۱۵۰۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں سے چند اشعار درج ذیل ہیں:

خواہم کہ کنم پیش تو دردِ دلِ خود عرض
لیکن بمقامی کہ تو باشی ومن آنجا
چشم کہ بود خانۂ خوش آب وہوائی
شایستۂ آنست کہ سازی وطن آنجا

☆☆☆

آن ترکِ شوخ دیدہ خود از دود مانِ کیست
یارب چنین خراب کنِ خانمانِ کیست
این سروِ سرفراز کہ خوش می چمد نباز
یارب چنین کشیدہ سر از بوستانِ کیست

چون نامہ نیاز ضمیری رسیدو خواند
پرسید بر سبیل تغافل از آنِ کیست

☆☆☆

نشانی ہیچ پیدا زان دہن نیست
سرِ موئی در این معنی سخن نیست

☆☆☆

این نہ اشکم زدیدہ می آید
دل خونین چکیدہ می آید
ہر سحر گل زنالۂ بلبل
جامہ برتن دریدہ میں آید

☆☆☆

جز آئینہ در روی تو دیدن کہ تواند
جز شانہ بزلفِ تورسیدن کہ تواند

☆☆☆

آن ترک ِ شہسوار چو عزمِ شکار کرد
تیری کہ زد بغیر، دلم را فگار کرد

☆☆☆

دل کہ شد دیوانہ عشقش چہ تدبیرش کنم
غیر از این کز حلقۂ زلفِ تو زنجیرش کنم

☆☆☆

نعمت سیّد نعمت اللہ نارنولی

سید نعمت اللہ نارنولی عہد شاجہانی (۱۶۲۷-۱۶۶۶ء) کے برگزیدہ بزرگ ہوگذرے ہیں۔انہوں نے عہد عالمگیر (۱۶۶۶-۱۷۰۷ء) میں وفات پائی۔ان کی ایک رباعی بلاحظہ ہو:

مائیم کہ از مخزن راز آمدہ ایم
در خلعت فخر سرفراز آمدہ ایم
دانای حقیقتم و بینائی مجاز
مقصود حقیقت و مجاز آمدہ ایم

☆☆☆

حضرت شاہ نصر اللہ نصرتیؔ مہمی

یہ مہم ضلع رہتک کے مشہور صدیقی خاندان کے ایک مشہور رکن تھے۔ یہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت (۱۶۵۸-۱۷۰۷ء) میں مہم میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام حضرت مفتی عزیز اللہ ابنِ مفتی حبیب اللہ تھا۔ انھوں نے تمام تعلیمی مراحل اپنے والد بزرگوار کے سایۂ عاطفت میں طے کیے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت نصرتی خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرادیا کرتے تھے۔

یہ فارسی کے اچھے شاعر بھی تھے۔ انھوں نے ایک مثنوی جنون المجانین بھی لکھی تھی۔ اس مثنوی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کے مصنف کا نام نصر اللہ اور تخلص نصرتی تھا۔ نمونے کے طور پر ان کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

حضرت صدیقؓ آن جد من است — حضرت فاروق آن سد من است
نصرتی صدیقی آمد در نسب — نصرتی نعمانی آمد در حسب
والد و شیخم عزیز اللہ" بود — عالم فاضل خدا آگاہ بود

☆☆☆

شیخ نورالدین نوریؔ ترخان سفیدونی سرہندی

نورالدین محمد بن سلطان علی رضوی الہروی کا تخلص نوریؔ تھا۔ وہ خراسان کے شہر جام میں پیدا ہوا تھا اور مشہد میں پرورش پائی۔ علم ہندسہ وحساب، نجوم اور حکمت میں کمال حاصل کیا۔ مرزا نصیرالدین ہمایوں (۱۵۳۰-۱۵۵۶) سے قریبی تعلقات تھے، اسی باعث اس کے مصاحبوں میں شمار ہوتے تھے۔ اپنی بذلہ گوئی اور خوش صحبتی کے سبب سے بادشاہ نے ترخان خطاب سے سرفراز کیا۔ ہمایوں ان کے نجوم کا بہت قائل تھا۔ اس نے

سرہند کے مضافات سفیدوں میں نورالدین کو جاگیریں عطا فرمائی۔ نورالدین نے جمنا سے ایک نہر نکالی اور اسے کرنال اور دوسرے شہروں تک بڑھایا۔ جب جہانگیر ۹۷۷ھ (۱۵۶۹ء) میں پیدا ہوا ہے اس وقت یہ نہر پایہ تکمیل کو پہنچی۔ اس لیے اس کے نام کی مناسبت سے اس کا نام شیخونی رکھا گیا تھا۔

جس زمانے میں بادشاہ اکبر نے حکیم مرزا (۹۸۹ھ/۱۵۸۱ء) پر لشکر کشی کی تو ترخان حکم عدولی کرتے ہوئے پنجاب سے لوٹ کر اپنی جاگیر پر چلے گئے۔ اس سے اکبر کو ان کی طرف سے بدگمانی پیدا ہوگئی۔ جب اکبر واپس فتح پور پہنچا تو ان کو حساب کتاب میں کھینچا اور چند سال قید رکھا۔ جب اکبر ۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء میں ٹونک کی طرف روانہ ہوا تو ان کو مقبرہ ہمایوں کی تولیت سپرد کر گیا۔ اسی سال وہیں انتقال ہوا۔

ترخان کو شاعری کا بھی شوق تھا۔ فارسی میں دیوان مرتب کیا تھا جو اب مفقود ہے۔ تذکروں میں کچھ اشعار ان سے منسوب ملتے ہیں، وہی نمونے کے طور پر یہاں دیے جاتے ہیں:

چون دستِ ما بدامن وصلت نمی رسد
پای طاب شکستہ بدامان نشستہ ایم
دلتنگ و دور از آن لب دندان نشستہ ایم[1]
مانند غنچہ سر بہ گریبان نشستہ ایم

دلی شہر کے حاکم تاتارخان سے ناخوشی کے باعث دلی کے ناموروں کی ہجو لکھی جو قریب دوسو پچاس شعر پر مشتمل ہے۔ مطلع یہ ہے۔

آہ ز دہلی مزاراتہ   دہ زخرابی عماراتہ

☆☆☆

□○□

---

[1] دل تنگ و دور از اں لب خندان نشستہ ایم: سرہند میں فارسی ادب ۳۰۸

حوالہ جات

مولانا ابوالحسن شیدائی فرید آبادی (ص-۱۶۰)
گلستان سخن - ۳۰۱
احتشام الدین شوکت نارنولی (-۱۶۲)
تذکرہ شعرائے جے پور:۲۹۵
مرزا احمد بیگ خان کامل تھانیسری (ص-۱۶۳)
روز روشن:۵۷۰
احمد بن محمد ہانسوی (ص-۱۶۴)
نزھۃ الخواطر:۱:۱۲۲
مولانا احمد تھانیسری (ص-۱۶۴)
علمائے ہند (اردو) :۱۰۳؛ طبقات شاہجہانی: ۴۰
تذکرہ مشائخ ہند:۱: ۱۴۰؛اخبار الاخیار:۱۵۰؛ تذکرہ علما:۱۳؛ ماثر الکرام:۱:۱۸۶؛حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی:۲۹؛ نزھۃ الخواطر:۳:۸
شیخ احمد شفیع نیر فرید آبادی (ص-۱۶۶)
خاندان لوہارو کے شعرا:۱۴۶
میر احمد علی حب فرید آبادی (ص-۱۶۷)
مجموعہ نغز:۱:۱۹۵؛ یادگار شعرا:۵۹؛ سخن شعراء ۶۹،۱۲۳؛ عیار الشعرا:۱۰۹؛ طبقات الشعراے ہند: ۳۹۸؛ پنجاب کے قدیم اردو شعرا:۲۳۰

اسلام احمد ہادی رہتکی (ص-۱۶۸)
جنگ آزادی اور شعرائے ہریانہ:۵۳
الطاف حسین حالی پانی پتی (ص-۱۶۸)
تلامذہ غالب :۱۴۳؛ تذکرہ شعراے پنجاب:۴۲۱؛ صبح گلشن :۱۱۶؛ خمخانہ جاوید:۲:۳۵۶؛ خطبات عالیہ: ۲:۲:۲۷؛ یادگار ضیغم:۳۹۰
امام الدین فدا فرید آبادی (ص-۱۷۳)
طبقات الشعراے ہند: ۱:۲۷۷؛گلشن بے خار:۱۴۶؛عمدہ منتخبہ: ۴۹۰؛ یادگار شعرا: ۱۳۰؛ عیار الشعرا:۲۸۸؛ گلستان بے خزاں: ۱۷۹؛ تذکرہ شعراے اردو (میر حسن):۱۴۳؛سخن شعرا:۳۵۸؛ گلشن سخن :۱۸۸؛گلشن ہند: (حیدری): ۷۸؛دو تذکرے: ۲:۹۴؛خوش معرکہ زیبا:۲:۵۵۱؛
حافظ امام بخش زار تھانیسری (ص-۱۷۴)
گلستان سخن: ۲۵۵؛ سخن شعرا:۱۹۹؛ طور کلیم :۴۷
مولوی امام بخش صہبائی تھانیسری (ص-۱۷۴)
تذکرہ شعرائے ہریانہ : ۱۶؛ خمخانہ جاوید: ۱: ۵۸۲؛ ۵:۱۶،۴۴۱؛ امام بخش صہبائی (سازی کتاب) ؛ طبقات شعرائے ہند: ۴۱۳؛ ۱۸۵۷ کے مجاہد شعرا: ۲۵۹-۲۸۷؛ تذکرہ شعرائے اردو: ۵۴۰؛ ڈریمز

فارگوٹن (انگریزی): ۴۰۱؛ یادگار غالب: ۲۶؛ تذکرہ اہل دہلی: ۱۳۸

امراؤ سنگھ عزیز سونی پتی (ص-۱۸۴)

یادگار ضیغم: ۲۵۳

برکت علی کشتہ بہادر گڈھی (ص-۱۸۴)

یادگار ضیغم: ۲۹۸

پیر محمد فزونی کرنالی (ص-۱۸۵)

نشتر عشق: ۳: ۱۱۵۰؛ روز روشن: ۵۲۹

میر جعفر زٹل نارنولی (ص-۱۸۶)

خمخانہ جاوید: ۲: ۲۳۰-۳۱؛ یادگار شعرا: ۵۶؛ تذکرہ شعرائے ہندی (میر حسن): ۹۳؛ مخزن نکات: ۲۱؛ نکات الشعرا: ۴۶؛ تذکرہ شعرای اردو (میر حسن) ۴۷؛ فارسی ادب بعہد اورنگ زیب: ۳۴۲؛ پنجاب میں اردو: ۲۲۲؛ تذکرہ شعرائے ہریانہ: ۱۲؛ تذکرہ شورش: ۲۷۹؛ تذکرہ تبسم گل: ۲۹؛ روز روشن: ۱۴۴؛ دلی کا دبستان شاعری: ۱۶۲

حضرت شیخ جمال الدین ہانسوی (ص-۱۹۰)

اخبار الاخیار: ۳۷؛ خمخانہ تصوف: ۱۱۴؛ آئین اکبری: ۳: ۴۱۱؛ سیر العارفین: ۳۳؛ سیر المتاخرین: ۲۷۶؛ ریاض الشعرا: ۱۵۶؛ تذکار ابرار: ۵۴؛ مخزن الغرائب: ۵۰۱؛ روز روشن: ۱۵۳؛ ڈریمز فورگوٹن: ۵۲؛ تذکرہ مشائخ ہند: ۱: ۱۲۴

لالہ حکیم چند ندرت تھانیسری (ص-۱۹۲)

سفینۂ خوشگو: ۳۵۲؛ گل رعنا: ۱۶۵

شیخ خادم علی خان خادم کیتھلی (ص-۱۹۵)

خم خانہ جاوید: ۳: ۱؛ گلشن بے خار: ۶۴؛ سخن شعرا: ۱۴۶؛ عمدۃ منتخبہ یعنی (تذکرہ سرور): ۲۵۳؛ یادگار شعرا: ۶۸؛ عیار الشعرا: ۱: ۱۱۹

منشی درگا پرشاد نشاد تھانیسری (ص-۱۹۶)

روز روشن: ۶۹۵

رائے رام جی ہاتف انبالوی (ص-۱۹۷)

ہمیشہ بہار: ۲۶۴

رشید الدین فائز نارنولی (ص-۱۹۸)

تذکرہ شعرائے جے پور: ۳۴۹

سعد اللہ مسیحا پانی پتی (ص-۲۰۰)

مارشل: ۲۸۸؛ ریؤ: ۱۰۷۸؛ کلمات الشعرا: ۱۰۶؛ روز روشن: ۶۲۸؛ نشتر عشق: ۴: ۱۴۳۳؛ مجمع النفائس: ۷۳-۷۴

سکندر علی خان فغان بھوانی (ص-۲۰۲)

خمخانہ جاوید: ۶: ۵۱۸

شاہ ولی اللہ پانی پتی (ص-۲۰۳)

ریؤ: ۳۵۸

مرزا شجاع الدین خان تاباں لوہارو (ص-۲۰۴)

خاندانِ لوہارو کے شعراء: ۳۲

شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی (ص-۲۰۵)

بیاض: مارچ ۱۹۷۸: ۱۳-۲۱؛ خم خانہ تصوف: ۱۴۵؛ اذکار ابرار: ۱۰۰؛ سیر المتاخرین: ۱: ۳۷۵؛ تحفۃ الکرام: ۲: ۱۰۲؛ اکبر نامہ: ۳: ۱۳۳ (انگریزی)، دی دہلی

سلطنت:۵۳۹؛ ایتھے: ۳۸۴-۴۰۳؛ ریو: ۲۶۸ (ب): ۱۰۹۰؛ اخبار الاخیار: ۱۳۵؛ نشترِ عشق: ۲: ۷۶۲؛ دی ڈریمز فور گوٹن: ۷۰؛ تذکرہ حسینی: ۱۶۲: ۱۶۴: ۱۶۵: تذکرہ مشائخ ہند: ۱: ۱۳۰؛

نواب شکر اللہ خان خوافی خاکسار نارنولی (ص-۲۱۳)

نشترِ عشق:۵۴۹؛ تاریخ محمدی:۸؛ تذکرہ الشعرا (مراۃ الخیال) ۲۵۶

نواب ضیاء الدین احمد خان نیّر رخشاں لوہارو (ص-۲۱۴)

خاندان لوہارو کے شعرا:۱۳۶؛ تلامذہ غالب:۵۳۳؛ تذکرہ شعرائے اردو:۲۳۳؛ تذکرہ اہل دہلی:۱۱۸

ملا طاہری پانی پتی (ص-۲۱۷)

طبقات شاہجہانی:۳۷۱

طفیلی حصاری (ص-۲۱۸)

صبح گلشن:۲۶۳؛ نشترِ عشق:۳: ۹۵۲

عاصی کرنالی (ص-۲۱۸)

دانش: شمارہ ۲۷-۲۸-۱۹۹۱-۱۹۹۲: ۲۷۶؛ شمارہ ۲۲: ۱۹۹۰: ۱۳۵؛ شمارہ:۲۴: ۲۵: ۱۹۹۰-۹۱: ۱۶۴

حافظ قاضی عبد الرحمٰن تحسین پانی پتی (ص-۲۱۹)

صبح گلشن:۸۲-۸۳؛ تذکرہ علمای ہند:۳۸ (فارسی)؛ تلامذہ غالب:۱۱۴-۱۱۵

شیخ عبد الفتاح فتاحی کرنالی (ص-۲۲۱)

طبقات شاہجہانی:۳۶۷

عبد الواحد وحشت تھانیسری (ص-۲۲۲)

کلمات الشعرا:۱۲۴؛ فارسی ادب بعہد اورنگ زیب: ۳۰۴؛ روز روشن:۷۵۳؛ تذکرہ حسینی: ۳۶۱؛ سفینہ خوشگو:۳۲

ابو البیان مولانا عثمان الدین تسلیم نارنولی (ص-۲۲۴)

تذکرہ شعرائے جے پور: ۱۳۴-۱۷۶

سید علاء الدین پانی پتی (ص-۲۲۸)

ہریانہ کا اتہاس:۲: ۱۹۳

نواب علاء الدین احمد خان علائی والی لوہارو (ص-۲۲۹)

خاندان لوہارو کے شعرا:۸۱؛ تلامذہ غالب:۴۲۰

عنایت اللہ شوق فرید آبادی (ص-۲۳۳)

گلستان سخن: ۲۹۱؛ سخن شعرا: ۲۵۶؛ اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد شعرا: ۲۸۲؛ ارباب سخن: ۳۳؛ یادگار ضیغم: ۱۸۴؛ پنجاب کے قدیم اردو شعرا: ۲۵۹

غلام حسین خان خیال پانی پتی (ص-۲۳۵)

طبقات شعرائے ہند:۲۶۹؛ بہار بے خزاں:۵۳؛ عمدہ منتخبہ یعنی (تذکرہ سرور):۲۴۸؛ یادگار شعرا:۷۱؛ گلشن بے خار :۶۷؛ سخن شعرا:۱۵۵؛ عیار الشعرا (قلمی لندن):۱۱۶؛ عیار الشعرا (قلمی، دہلی):۷۶

حکیم میر فضل اللہ مرزا پانی پتی (ص-۲۳۶)

طبقات الشعرائے ہند: ۳۴۹؛ گلشن بے خار: ۱۷۵؛ یادگار شعرا:۱۵۵؛ عمدہ منتخبہ یعنی (تذکرہ سرور):۴۴۴؛ عیار الشعرا:۳۴۲

میر قاسم علی قاسم پانی پتی (ص-۲۳۷)

گلستان سخن: ۳۹۷

قلندر شاہ بخش ترابی پانی پتی (ص-۲۳۷)

صبح گلشن: ۸۴؛ نشتر عشق: ۱: ۲۹۳

حافظ قلندر بخش زیرک پانی پتی (ص-۲۳۸)

گلستان سخن: ۲۵۹؛ نزہۃ الخواطر: ۷: ۳۹۰

میر قمر الدین منت سونی پتی (ص-۲۳۸)

صحف ابراہیم: ۱۲۹؛ گلشن ہند (حیدری) ۹۲ (پایہ ورق)؛ مجموعہ نغز: ۱۶۸؛ تذکرہ شعرائے اردو: ۱۶۶؛ تذکرہ شعرائے ہندی: ۲۹۴؛ تذکرہ جلوہ خضر: ۲۰۲؛ گلشن بے خار: ۱۹۳؛ سفینہ ہندی: ۱۹۳ گلشن ہند (گلزار ابراہیم) ۲۳۰؛ سخن شعرا: ۴۵۷؛ تذکرہ ہندی: ۲۳۸؛ عیار الشعرا: ۳۶۴؛ طبقات شعرائے ہند: ۱۷۸؛

مولوی شیخ کرامت علی اعجاز نارنولی (ص-۲۴۵)

تذکرہ شعرائے جے پور: ۹۳

گھمنڈی لال عاشق حصاری (ص-۲۴۷)

تذکرہ گلشن خندہ: ۱۰۳

گیان رائے ہنر جھجھری (ص-۲۴۷)

نشتر عشق: ۵: ۱۸۰۰؛ گل رعنا: ۱۸۱

شاہ لطف اللہ انبالوی (ص-۲۴۹)

علمائے ہند (اردو): ۴۰۱؛ برکات اولیا: ۱۶۱؛ خزینۃ الاصفیا: ۱: ۴۵۸

لطیفن زہرہ کرنالی (ص-۲۵۰)

تذکرۃ النسا: ۹۵؛ تذکرۃ الخواتین: ۶۹؛ بہارستان ناز: ۱۵؛ ادب لطیف یعنی عورتوں کی شاعری: ۷۷

محبوب علی شاہ اصغری کرنالی (ص-۲۵۱)

تذکرہ سخنواران چشم دیدہ: ۱۱

محمد افضل قادری پانی پتی (ص-۲۵۱)

سلک گہر: ۳۰

محمد بیگ محوی ریواڑوی (ص-۲۵۴)

گلستان سخن: ۴۱۹؛ سخن شعرا: ۴۲۳؛ تذکرہ شعرائے جے پور: ۴۵۸

محمد جعفر خان راغب پانی پتی (ص-۲۵۶)

یادگار شعرا: ۸۰؛ گلشن ہند (حیدری): ۶۲؛ ریاض الفصحا: ۱۱۵؛ گلشن سخن: ۱۳۵؛ طبقات الشعرائے ہند: ۲۴۶؛ صحف ابراہیم: ۷۵؛ سفینہ ہندی: ۸۶؛ باغ معانی: ۹۷؛ نشتر عشق: ۲: ۶۰۹

خواجہ محمد عاقل سونی پتی (ص-۲۵۹)

صبح گلشن: ۲۷۴؛ صحف ابراہیم: ۱۰۵؛ نشتر عشق: ۳: ۱۰۵۴

قاضی محمد عمر روحی انبالوی (ص-۲۶۰)

شیرازہ ۱۱-۱۲، ۱۹۸۹: ۴۸

مولوی محمد عین الدین مسرور روہتک (ص-۲۶۱)

روز روشن: ۴: ۲۷-۶۲۶

مرزا محمد قتیل فرید آبادی (ص-۲۶۳)

تذکرہ شعرائے ہریانہ: ۱۱؛ فسانۂ غالب: ۱۱۸؛ نشتر عشق: ۴: ۱۲۵۳؛ سفینہ ہندی: ۱۷۲؛ کٹیلوگ آف عربیک اینڈ پرشین منوسکرپٹ؛ خدا بخش لائبریری: ۳: ۲۶۲؛ مطلع انوار: ۵۱۶؛ تذکرہ خوش معرکہ زیبا: ۱: ۲۹۶؛ نتایج الافکار: ۴۲

محمد وحید الزماں سیماب رہتکی (ص-۲۶۶)

جنگ آزادی اور شعراے ہریانہ:۸۹

مولوی محمد بسمل تھانیسری (ص-۲۶۷)

پنجاب کے قدیم اردو شعرا:۶۳؛ مجموعہ نغز:۱:۱۰۴

مختی (عیشی حصاری (ص-۲۶۸)

طبقات شاہجہانی: ۲۸۴؛ صبح گلشن: ۲۹۶؛ منتخب التواریخ:۳:۲۴۸؛ سرہند میں فارسی ادب:۱۴۸؛ روز روشن:۶۱۱

شیخ معین الدین صبور نارنولی (ص-۲۶۹)

گلستان سخن:۳۱۸

ملا نسبتی تھانیسری (ص-۲۶۹)

ریاض الشعرا:۸۶۸؛ کلمات الشعرا:۱۱۸؛ مآثر رحیمی: ۱۳۸۴؛ عمل صالح:(۳)۳۲۷؛ ہمیشہ بہار: ۲۴۶؛ تذکرہ حسینی: ۳۵۱؛ تلامذہ غالب: ۳۹۵؛ نشتر عشق:۱۶۲۶؛ روز روشن:۶۹۲

شیخ نظام الدین ضمری سفیدونی (ص-۲۷۲)

نشتر عشق:۳:۹۱۰

نعمت سیّد نعمت اللہ نارنولی (ص-۲۷۵)

صبح گلشن:۵۳۱

حضرت شاہ نصر اللہ نصرتی مہمی (ص-۲۷۵)

تذکرہ صوفیاے میوات:۶۲۲

شیخ نور الدین نوری ترخان سفیدونی سرہندی (ص-۲۷۶)

طبقات شاہجہانی: ۲۴۷؛ تذکرہ علماے ہند (اردو) ۵۳۶؛ سرہند میں فارسی ادب:۳۰۸؛ نزہۃ الخواطر: ۳۸۳؛ تذکرہ الشعرا:۲۹، ۶۵

□○□

مواخذ

(فارسی، اردو)

آب حیات	محمد حسین آزاد	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1987
آثار الصنادید	سرسید احمد خان	نول کشور پریس لکھنؤ
آئین اکبری (فارسی)	ابوالفضل	ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۴۹-۱۹۸۴
اخبار الاخیار	عبدالحق محدث دہلوی	کتب خانہ رحیمیہ دیوبند ۹۹۹-۹۳۹ھ
ادب لطیف یعنی عورتوں کی شاعری	نسیمہ بیگم دہلوی	الامان پریس دہی
ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ	ڈاکٹر سید عبداللہ	انجمن ترقی اردو- دہلی
اذکار ابرار (اردو ترجمہ گلزار ابرار) مترجم فصل احمد جیوری	محمد غوثی شطاری مانڈوی	اسلامک فاؤنڈیشن- لاہور ۱۳۹۵ھ
ارباب سخن	مولانا حسرت موہانی، مرتبہ ڈاکٹر احمر لاری	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۲
امام بخش صہبائی: شخصیت، شاعر، شارح	خواجہ محمد حامد	بزم غالب، کامٹی ۱۹۸۲
باغ معانی، نقش علی	مرتبہ عابد رضا بیدرد	خدابخش اورینٹل لائبریری پٹنہ
برکات اولیا	سید امام الدین دہلوی	افضل المطابع دہلی، ۱۳۲۲ھ
بزم تیموریہ (ج-۳)	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۹۸۱
بہارستان ناز	حکیم فصیح الدین رنج، مرتبہ خلیل الرحمٰن اوودہی	مرتبہ خلیل الرحمٰن اوودی، لاہوری ۱۹۶۵
بیاض	تحقیقی مجلہ فارسی	شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی، دہلی
پنجاب کے قدیم اردو شعرا	خورشید احمد خان یوسفی	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۹۲

پنجاب میں اردو	حافظ محمود خان شیرانی	مکتبہ کلیان بشیرت گنج لکھنؤ ۱۹۶۰
تاریخ ادبیات ایران (اردو)	ڈاکٹر رضازادہ شفق	ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۶۹
تاریخ جھجری	منشی غلام نبی	مطبع فیض احمدی، تالیف ۱۸۶۵
تاریخ فرشتہ (اردو)	محمد قاسم فرشتہ	کوثر پریس سہارنپور، ۱۸۹۵
تاریخ محمدی	امتیاز علی عرشی شیخ احمد حسین	کوثر پریس، سہارنپور، ۱۸۹۵
تحفۃ الکرام	علی شیر قانع	۱۷۶۷
تذکرۃ الخواتین	مرتبہ، مولوی عبدالباری	نول کشور پریس ۱۲۹۳ھ، لٹریری سوسائٹی میرٹھ، ۱۸۹۵
تذکرۃ الشعرا (مراۃ الخیال)	شیر خان لودی	بمبئی ۱۳۲۶ھ
تذکرہ الشعرای، تصحیح ومقدمہ	پروفیسر عبدالغنی میرزایف	دانشگاہ، کراچی، پاکستان ۱۹۷۶
تذکرہ النسا	منشی درگا پرشاد	اکمل المطابع دہلی، ۱۳۰۰ھ
تذکرہ اہل دہلی	سر سید احمد خان۔ مرتبہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی،	انجمن ترقی اردو، پاکستان
تذکرہ بے بہانی تاریخ العلما	جناب مولینا سید محمد حسین نوگانوی	کاظم بک ڈپو، دہلی ۱۹۳۱
تذکرہ بہار بے خزاں	احمد حسین سحر	تصحیح ڈاکٹر نعیم احمد علی مجلس دلی، ۱۹۶۸
تذکرہ تبسم گل	ڈاکٹر شیخ عظمت الٰہی سلونوی	عظمت پریس، لکھنؤ، ۱۹۲۷
تذکرہ جواہر زواہر (جلد اول)	ڈاکٹر مولوی بشیر الدین احمد، مرتبہ ابرار حسین فاروقی	جواہر میوزیم واسلامیہ انٹرمیڈیٹ کالج، اٹاوہ، ۱۹۵۹
تذکرہ حسینی	میر حسن دوست سنبلی	نول کشور پریس ۱۸۸۵
تذکرہ جلوہ خضر	حضرت سید فرزند احمد صفیر بلگرامی	مطبع نورالانوار، آرہ- ۱۸۸۵
تذکرہ خوش معرکہ زیبا	سعادت علی خان ناصر، مرتبہ مشفق خواجہ	مجلس ترقی ادب، ۲، نرسنگ داس گارڈن، کلب روڈ، لاہور ۱۹۷۰

(عمدہ منتخبہ یعنی) تذکرہ سرور	نواب اعظم الدولہ میر محمد خان بہادر سرور	شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی، ۱۹۶۱
تذکرہ شعرائے اردو	میر حسن	اتر پردیش اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۵
تذکرہ شعرائے پنجاب	خواجہ عبدالرشید	اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۸۱
تذکرشعرائے جے پور	احترام الدین احمد شاغل	انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڈھ، ۱۹۵۸
تذکرہ شعرائے ہریانہ	رانا گنوری	ناشر ڈاکٹر رانا گنوری، ۱۹۸۳
تذکرہ شعرائے ہندی	میر حسین، مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری	اردو پریس نظیر آباد، ۱۹۷۹
تذکرہ شورش (رموز الشعرا)	غلام حسین شورش، مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی	اتر پردیش اکادمی، ۱۹۸۴
تذکرہ صوفیائے میوات	محمد حبیب الرحمٰن خان میواتی	میوات اکادمی، گھاسیڑا، گوڑگاوں، ۱۹۸۴
تذکرہ علما	محمد حسین آزاد	کریم پریس لاہور، ۱۹۲۲
تذکرہ علمائے ہند (اردو)	مولوی رحمٰن علی، مرتبہ وترجمہ محمد ایوب قادری	پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۱
تذکرہ علمای ہند (فارسی)	مولوی رحمٰن علی	لکھنؤ، ۱۹۱۶
تذکرہ گلشن خندہ	مولوی عبدالباری	نگارستان پریس لکھنؤ
تذکرہ مشائخ ہند	مولانا اسلام الحق صاحب مظاہر	ادارہ اسلامی دارالمطالعہ سہارنپور، ۱۹۹۸
تذکرہ ماہ وسال	مالک رام	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۱
تذکرہ مقالات الشعرا	قیام الدین حیرت اکبر آبادی، تالیف نثار احمد فاروقی	علی مجلس، ۱۴۲۹، چھتا نواب شاہ فراش خانہ دہلی، ۱۹۶۸
تلامذہ غالب (اردو)	مالک رام	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، ۱۹۸۴
جلوہ خضر	حضرت سید فرزند احمد اصغر بلگرامی	مطبع نورالانوار آرہ، ۱۸۸۵

جمناتٹ (اردو رسالہ) ہریانہ اردو اکادمی، پنچکولہ

جلد	شمار	سال	صفحہ
۲	۳:۴	۱۹۸۹	۱۴۲
۳	۳:۴	۱۹۸۹	۸۱
۴	۱	۱۹۹۰	۱۶
۵	۲	۱۹۹۲	۲۸

جنگ آزادی اور شعرائے ہریانہ	کے-سی-یادو	ہریانہ اردو اکادمی، ۱۹۹۱
حدائق الحنیفہ	مولوی فقیر محمد جہلمی، مرتبہ خورشید احمد خان	مکتبہ حسن سہیل لمٹڈ، لاہور
حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی	خلیق احمد نظامی	ندوۃ المصنفین، ۱۹۶۴
خاندان لوہارو کے شعرا	حمیدہ سلطان احمد	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ۱۹۸۱
خبرنامہ (ماہنامہ اردو)	جنوری فروری، ۱۹۹۲	ہریانہ اردو اکادمی، پنچکولہ
خزینۃ الاصفیا (جلد اول)	مفتوی غلام سرور لاہوری	نول کشور پریس، ۱۹۸۴
خطبات عالیہ (حصہ دوم)	مولوی انوار احمد زبیری (مارہوری)	مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڈھ، ۱۹۲۷
خمخانہ تصوف	ڈاکٹر ظہور الحسن شارب	تاج پبلشرز، دہلی ۱۹۶۵
خمخانہ جاوید (جلد اول)	لالہ سری رام	مخزن پریس دہلی، ۱۹۰۸
(جلد دوم)	〃	امپیریل پریس بکڈ پو، دہلی، ۱۹۱۱
(جلد سوم)	〃	دلی پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۱۷
(جلد چہارم)	〃	ہمدرد پریس، دہلی، ۱۹۲۶
(جلد پنجم)	〃	امیر چند گھتا، دہلی، ۱۹۴۰
خیر المجالس	خواجہ نصیر الدین شاہ، چراغ دہلوی، مترجم مولانا احمد علی	نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۷۱
دانش (مجلّہ)	محمد امیر چیمہ	رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران، ، اسلام آباد

۲۷-۲۸	۱۹۹۱-۹۳	۲۷۶
۲۲	۱۹۹۰	۱۳۵
۲۴-۲۵	۱۹۹۰	۱۶۴
دستور الفصاحت	حکیم سید احمد علی یکتا، مرتب امتیاز علی خان عرشی	رامپور، ۱۹۴۳
دلی کا دبستان شاعری	نوالحسن ہاشمی	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۹۲
دو تذکرے (جلد اول) دوم	مرتب کلیم الدین	لبیل لیتھو پریس، رومنہ روڈ پٹنہ، ۱۹۵۹
ذکر غالب	مالک رام	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، ۱۹۴۰
رسالہ ذکر مغنیان ہندوستان بہشت نشان	عنایت نشان راسخ، مرتبہ، سید علی حیدر نیر	ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، بہار (پٹنہ)
روز روشن	مولوی مظفر حسین صبا	مطبع شاہجہانی بھوپال، ۱۹۲۷ھ
ریاض الشعرا	والہ داغستانی	نشنل میوزئیم دہلی
ریاض الفصحا	غلام ہمدانی مصحفی	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۵
سخن شعرا	عبدالغفور نساخ	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۲
سخنوران چشم دیدہ	مولانا مولوی ترک علی شاہ ترکی قلندر نور محلی	مطبع شمس الاسلام
سرہند میں فارسی ادب	ڈاکٹر ادریس احمد	دہلی ۱۹۸۸
سفینۃ الاولیا	شہزادہ دارا شکوہ	صابری بک ڈپو، دیو بند
سفینہ خوشگو	بندراین داس، مرتبہ عطا الرحمن کاکوری	پٹنہ ۱۹۵۹
سفینہ ہندی	بھگوان داس ہندی	پٹنہ ۱۹۵۸
سلک گوہر (حصہ اول)	جاوید انصاری برہان پوری	۱۹۴۸
سیر الاقطاب	عبدالرحیم الہ دیہ الچشتی	مطبع نامی، لکھنؤ، ۱۹۱۳
سیر العارفین	مولانا فصل اللہ	مطبع رضوی دہلی، ۱۸۹۳
سیر المتاخرین	غلام حسین طباطبائی حسنی	نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۸۷۱

شیرازہ (اردو رسالہ) نومبر ۱۹۸۹، شمارہ ۱۱-۱۲ جلد ۲۸، ص ۴۸، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس کلچر اینڈ لنگوجیز، سری نگر

صبح گلشن	سید علی حسن خان	مطبع شاہجہانی، بھوپال، ۱۲۹۵ھ
صحف ابراہیم	علی ابراہیم خان خلیل	خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ
طبقات الشعرا	قدرت اللہ شوق، مرتبہ محمد ابو اللیث صدیقی، البدایونی	
طبقات شعرائے ہند	مولوی کریم الدین	اتر پردیش اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۳
طبقات شاہجہانی	محمد صادق، مخطوطہ	نیشنل میوزیم، نئی دہلی
طور کلیم	ابو الخیر نور الحسن	مطبع مفید عامہ، آگرہ
عمل صالح	محمد صالح کنبوہ	کلکتہ، ۱۹۳۹
عیار الشعرا (قلمی)	خوب چند ذکا	انڈیا آفس لائبریری، مارچ، ۱۹۵۲
فارسی ادب بعہد اورنگ زیب	نور الحسن انصاری	انڈو پرشین سوسائٹی دلی، ۱۹۶۱
فسانہ غالب (اردو)	مالک رام	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، ۱۹۷۷
قصر علم	مرتبہ صاحبزادہ شوکت علی خان	عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک، راجستھان
کلمات الشعرا	محمد افضل خان سرخوش	شیخ علی مبارک تاجر کتب، لاہور، ۱۹۴۲
کلمات الصادقین	محمد صادق دہلوی کشمیری ہمدانی	
دکتر محمد سلیم اختر	مرتبہ ڈاکٹر محمد سلیم اختر	مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد، ۱۹۸۸
گل رعنا	لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی	حیدر آباد دکن ۱۳۲۳ھ
گل عجائب	اسد علی خان تمنا	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، ۱۹۳۶
گلستان بے خزاں	قطب الدین باطن	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۲
گلستان سخن	مرزا قادر بخش بہادر صابر	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۲
گلشن بے خار	نواب مصطفیٰ خان شیفتہ	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۲

گلشن ہند	سید حیدر بخش حیدری، مرتبہ مختار الدین احمد	علمی مجلس دلی، ۱۹۶۷
گلشن ہند (گلزار ابراہیم)	مرزا علی لطف	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۶
مآثر الاکرام (دفتر اول) موسوم بہ سرو آزاد	میر غلام علی آزاد بلگرامی	مطبع دخانی، رفاہ عام، لاہور، ۱۹۱۳
مآثر رحیمی	عبدالباقی نہاوندی، مرتبہ مولوی ہدایت حسین	ایسیاٹک سوسائٹی، کلکتہ ۳۱-۱۹۲۴
مجمع النفائس	سراج الدین علی خان آرزو، تصحیح و ترتیب عابد رضا بیدار	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۱۹۹۲
مجموعۂ نغز	ابو القاسم میر قدرت قاسم، مرتب محمود شیرانی	نیشنل اکادمی، دہلی، ۱۹۷۳
مخزن الغرایب	شیخ احمد علی خان ہاشمی سندیلوی	لاہور، ۱۹۶۸
مخزن نکات	محمد قیام الدین قائم چاند پوری	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۵
مطلع انوار	مولانا الحاج سید مرتضیٰ	حراسان اسلامک ریسرچ سنٹر، کراچی، ۱۹۸۱
نتایج الافکار	مولانا قدرت اللہ گوپاموی	اردشیر خاضع، بمبئی ۱۳۳۶ھ
نزہۃ الخواطر	عبدالحئی بن فخر الدین	دائرۃ المعارف اسلامیہ عثمانیہ، ۵۷-۱۹۵۵
نشتر عشق	حسین قلی خان عظیم آبادی	نشریات دانش دوشنبہ، ۱۹۸۱
نکات الشعرا	میر تقی میر، مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۴
ہمیشہ بہار	کشن چند اخلاص، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی	انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۳

ہندوایران (مجلہ فارسی انگلس)

شمارہ ۲، سال ۴، ۴۵، خانہ فرہنگی ایران نیو دہلی

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں	مولانا ابوالحسنات ندوی	معارف دارالمصنفین، اعظم گڈھ، ۱۹۷۱
یادگار حالی	صالح عابد حسین	انجمن ترقی اردو، علی گڈھ،
یادگار شعرا	اسپرنگر، مرتبہ طفیل احمد	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۵
یادگار ضیغم	محمد عبداللہ خان ضیغم	مطبع گلزار حیدر آباد
یادگار غالب	الطاف حسین حالی	تاجر مبارع علی، لاہور، ۱۹۳۲
۱۸۶۷ کے مجاہد شعرا	مولانا امداد صابری	مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی، ۱۹۵۹

English

Administration of the Sultanate of Delhi, Ishtiaq Hussain Qureshi, Oriental Reprint 1977.

An Advanced History of India. R.C. Majumdar, H.C. roy Caudhari, Kali Kinkar Datta- Macmillon India- 1970.

Advanced study in the History of Medieval India, Medieval Indian Society and Culture. J.L. Mehta. Sterling Publishers (P) Ltd. 1983.

Aain-e-Akbari Abul Fazal Ed. Col. H.S. Jarret Orient Reprint, Delhi-1978.

Akbar Namah - H. Beveridge, Rare Books, Delhi-1979.

Ambala District Gazetteer, B.R. Publishing, Delhi- 1983.

An Oriental Biographical Dictionary, Thomas William Beele, Kalyan Publications- Ludhiana. 1972.

Catalouge of Arabic and Persian MSS, Khuda Bakhsh Library- Patna.

Catalouge of Persian Printed Books- Asiatic society, Calcutta. 1967.

Catalouge of Persian MSS in the Library of India Office-Vol. I-II, Herman Ethe-Oxford-1907-1937.

Catalouge of the Persian MSS in the British Museum Vol. I-III- Charles Rieu. London- 1879-93.

District and State Gazetteer of undevided Punjab, Vol. IV, Delhi-1985.

Dreams Forgotten - Waris Kirmani. Department of Persian, Aligarh Muslim University, 1984.

Education in Medieval India K.L.Rai, B.R. Publishing, Delhi-1984,

Education In Muslim India (1000-1800) S.M. Jaffar. Idarah-i-Adabiyat-i-Delhi- 1972.

Glimpses of Medieval India and Culture: Yusuf Husaini, Asia Publishing House, Delhi-1959.

Haryana: Ancient and Medieval, M.A. Phadke. Harnam Publishing House, New Delhi-1991.

Haryana: Studies in History and culture- K.C. Yadav. Macmillan-Delhi- 1981.

History and Culture of Indian People: The Mughal Empire. R.C. Majumdar, J.N. Chaudhari, S.Chaudhari. Bhartiya Vidya Bahwan, Bombay, 1974.

History of Culture of the Indian People The Delhi Sultanate. R.C. Majumdar, A.D. Pusalkar, A.K. Majumdar. Bhartiya Vidya Bhawan-Bombay-1967.

History of India as told by its own Historians-Elliot and Dowson, Kitab Mahal- Allahahbad.

History of Hisar- M.M. Juneja. Modern Book Co. Hisar, 1989.

History of Indegenous Education in the Punjab: G.W.Leither: Language Department, Punjab, 1971.

History of the Rise of The Mohammedan Power In India- J. Briggs.Editions Indian, Calcutta - 1966.

Imperial Gazetteer, 5:18, B.R. Publishing, Delhi- 1983.

Journal of the Asiatic Society of Bengal, Vol. 3, No.8, P. 583-84.

Kashir - G.M.D. Sufi, Light and Life Publishers, New Delhi- 1974.

Life and culture In Medieval India, B.N. Luniya, Kamal Prakashan.

Indore- 1978.

Mughals In India, A Bibliographical Survey- D.N. Marshal, Asia Publishing House, Delhi-1967.

Muntakhab-ul-Tawarikh-Abul Qadir Badayuni, Ed, Sir Welseley Haig, Academica Asiatica, Patan-1973.

Muslims and Changing India, Dr. Y.B. Mathur. Trimurti Publication (P) Ltd. New Delhi.

Persian Literature: A Bibliographical Survey V.1. Parts I and II- C.A. Storey. London-1927-53

Promotion of Learning During Mohammedan Rule, N.N.Law. Longman's Green & co. 1916.

Punjab under Sultans, Bakshish Singh Nijjar, Sterling Publicatios (P) Ltd. Delhi-1968.

The Shahjahan of Delhi, B.P. Saksena, Allahabad Central Book, 1973.

A Social, Cultural and Economic History of India- vol.II. P.N. Chopra, M.N. Dass, B.N. Puri, The Macmillan Co. of India Ltd. 1974.

The Tabqat-i-Akbari, Khwaja Nizamuddin, Ed. Brijendra Nath De, Low Price Publication, Delhi-1992

हिन्दी के सूत्र:

हरियाणा: डी, सी वर्मा, नैशनल बुक ट्रस्ट, इनडिया, दिल्ली, 1979

हरियाणा: एक सांस्कृतिक अध्यन, देवी शंकर प्रभाकर, उमेश प्रकाशन, दिल्ली, 1967

हरियाणा का इतिहास, डा॰ के,सी, यादव, मैक्मिलन, नई दिल्ली, 1981

हमारे देश के राज्य, शशि भूषण, नैशनल बुक ट्रस्ट दिल्ली 1972